کتنے جلوے کتنے طور



امتیاز ادیب

شیخ شوکت علی اینڈ سنز

کتنے جلوے کتنے طور

کتنے جلوے، کتنے طور

(ایک جذباتی ناول)

امتیاز ادیب

ناشران

شیخ شوکت علی اینڈ سنز
بندر روڈ، کراچی

قیمت: ———— آٹھ روپے

بار اوّل

(ایجوکیشنل پریس کراچی)

انتسابؔ

ننھّے امجد علی کے نام

امتیاز ادیبؔ

جبیں پہ مسرت کی صبحِ درخشاں فریبِ تماشائے ذوقِ نظر ہے
اُفق تا اُفق یہ جو اک روشنی ہے میں اس روشنی کا بھرم جانتا ہوں

امتیاز ادیب

ترتیب

اے روشنیوں کے شہر

کافی انتظار کے بعد اُسے ایک خالی میز دستیاب ہو سکی تھی۔ اور اب وہ کیفے کے ماحول سے قطعی طور پر بے نیاز ہو کر گرم چائے کی پیالی سے اپنے تھکے ہوئے اعصاب کو عارضی سکون پہنچا رہا تھا۔

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔

گاہکوں کی سرگوشیاں ——— بلند قہقہے ——— متبسم چہرے ——— گرانڈیل جسم ——— اور ——— مدقوق و کمزور انسانوں کے وجود سے کیفے کا ہال بھرا ہوا تھا ——— فرض شناس بیرے اِدھر اُدھر تیزی سے یوں دوڑ رہے تھے جیسے یہ اُن کی زندگی کی آخری دوڑ ہے اور اس کے بعد اُن کے پاؤں تھک جائیں گے، سانس پھول جائے گی، اور وہ ہال کے فرش پر اوندھے منہ گر کر دم توڑ دیں گے

اُس نے چائے کی پیالی سے نظریں ہٹا کر باہر دیکھا۔
باہر روشنی تھی۔ — روشنی کا سیلاب سڑکوں پر اُمنڈا آرہا تھا۔ زندگی وقت کو اپنی جلو میں لئے اَن دیکھی منزلوں کی طرف رواں دواں تھی —— ہر چیز دوڑ رہی تھی — کاریں۔ بسیں، رکشائیں، انسان، ماحول سب کے سب بھاگ رہے تھے — نہ جانے کہاں — نہ جانے کونسی منزل کی طرف۔ — مسلسل دوڑ جاری تھی — روشنیاں بھاگ رہی تھیں — تیز اور دھیمی روشنیاں — تمدنی آسمان کے گوشوں پر پھیلتی جا رہی تھیں۔ ہر چیز ان کی زد میں تھی — سڑکوں پر رینگنے والی مخلوق بھی اور محلوں میں رہنے والے خوش نصیب انسان بھی —
کیفے میں معمول کے مطابق قہقہے بکھر رہے تھے۔
بیرا —! ایک پلیٹ چانپ لاؤ —"
بیرا —! ہاف سیٹ اسپیشل چائے۔
بیرا! ایک گلاس پانی۔
اور بیرے نے جب اُسے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ پلٹ کر دیکھا تو اُس نے اپنی نظریں جھکا لیں —— اُسے اپنا حلق خشک ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا — زندگی کے منتشر اوراق پر ندامت کی ایک اور مہر لگ چکی تھی ——
"اَپُن کو کیا پتہ؟ —— یہ سالا دن ہی کچھ کھوٹا ہے۔ بلیک ایک دم گم غائب ہو گیا —— کمائی کھتم! —— اپن لوگ تو پاگل ہو جائیں گا!

ایک دم پاگل!——

اُس کی پُشت والی میز پر اسی سماج کے دو چلتے پھرتے کردار سر جوڑے بلیک کے غائب ہو جانے کا ماتم کر رہے تھے —— اور اُس کے داہنی طرف بچھی ہوئی میزوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ سامنے چند شاعر بیٹھے تھے۔ جن کے زرد چہرے — بے نور آنکھیں، خشک اور پریشان بال، ان کے عظیم افلاس کی شہادت دے رہے تھے —— وہ سب پوری تن دہی سے یوں بحث کر رہے تھے جیسے اُن کی بحث سے امنِ عالم کی سلامتی کا مسئلہ وابستہ ہے۔

"فن، برائے فن —"

"فن، برائے ادب —"

"فن، برائے زندگی" —

"نہیں —" ایک دُبلا پتلا شاعر چونک کر بولا

"فن، برائے انسانیت —" ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے لکھا ہے، میکسیم گورکی کہتا ہے۔ وہ فن جو زندگی اور انسانیت سے بے تعلق ہے مُردہ ہے —"

اُسے محسوس ہوا جیسے معصوم شاعر لاشعوری طور پر جھوٹ بول رہے ہیں — ویسے تو شاعر جھوٹ بولنے کے عادی ہوتے ہیں! —— لیکن جب زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا ہو۔ جب ایک اندوہناک فیصلہ تسلیم کرنے کا وقت ہو — جب کسی قافیہ پیمائی کی بات نہ ہو اُس

وقت تو بیچارے ان فن کاروں کو سچ بول لینا چاہیے! ——— لیکن یہ سچ بول بھی کیسے سکتے ہیں؟ — جھوٹ کی سلطنت کے قوانین کب گوارہ کریں گے کہ یہ لوگ فن و ادب کی بے نام بحث چھوڑ کر دنیا کے سامنے اپنی تلخ زندگی کا ماتم شروع کردیں! ——— یہ جس روشنی کے گیت گاتے ہیں اُس کے بارے میں انھیں خود بھی نہیں معلوم — وہ روشنی کسی شہر میں نہیں ہے — وہ ایک واہمہ 'ایک فریب' اور ایک پاگل پن کے سہارے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

ٹی۔ ایس ایلیٹ لکھتا ہے۔

ٹی۔ ایس ایلیٹ کچھ نہیں لکھتا! — اور "میکسم گورکی" قبر کی تنہائیوں میں سوچ چکا ہے! —

"بیرا! ایک پلیٹ بریانی —"

"بیرا — دو پلیٹ کٹلس —" ساتھ والی میز سے آواز آئی

اور بیرے پھر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے! — پلیٹیں اور گلاس کھنکنے لگے — شور تیز ہوگیا — اور دروازے کے پاس والی ٹیبل پر بیٹھا ہوا ایک فلم پروڈیوسر یوں قہقہے لگا رہا تھا جیسے یہ کھوکھلے قہقہے اس کی فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کا ایک حصہ ہیں! — جیسے یہ کھوکھلے قہقہے مارکیٹ میں نیلام ہوجانے والی مار دھاڑ سے بھرپور فلم کا منافع ہیں۔

"سالا یہ پاکستان کا لوگ آرٹ کو کیا سمجھے گا؟ — اپن جو بھی فلم بناتا ہے اُسے ایک دم کھلا س ہونا پڑتا ہے —"

فلم پروڈیوسر کے دوست بولے
"میرا خیال ہے فلم میں گانوں کی کمی ہو گی۔"
"بالکل گلت! ہم اپنی فلم میں ایک ڈزن گانے دیتا ہے مجے دار گانا۔ پبلک کی مرجی کے مافک۔"
"اور رقص؟"
"تم! ڈانس کی کیا بات کرتا ہے۔ بھلا ہماری فلم میں اور ڈانس نہ ہو؟ — بنگالی، پنجابی، سرحدی، مصری، انگلش، گرج ایک ملک کا ڈانس ہماری فلم میں ہوتا ہے — مگر سالا یہ کسمت؟ — ہمارا کسمت بہوت کھراب ہے۔"

فلم پروڈیوسر منہ بنا کے خاموش ہو گیا۔ اُسے اپنی خراب قسمت سے شکایت تھی۔ سینما والوں سے شکایت تھی — عوام سے شکایت تھی۔ اور اسے خود کو اس فلم پروڈیوسر سے — ان مدقوق شاعروں سے — ان دو بزنس مینوں سے۔ اس کیفے سے اور کیفے کے بیروں سے شکایت تھی — ایک رنج تھا۔ ایک عداوت تھی — ایسی عداوت، جسے اس کی روح کی گہرائیوں نے نفرتوں کی سیج پر جنم دیا تھا۔ اور جواب جوالا مکھی بنتی جا رہی تھی —

"تم! آرٹ کی عظمت سے کب تک کھیلتے رہو گے؟ پیارے فلم پروڈیوسر! حقیقت آشنا زندگی اب تمہارے فریب میں نہیں آسکتی۔

اور پھر اُس نے اُن شاعروں کو دیکھا جو والہانہ انداز میں پان چبا

چبا کر بحث کر رہے تھے ۔ اور تم! وہ مریض ہو جس کی دوا کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے۔ تم اسی طرح روتے بسورتے زندگی کی ویران شاہراہوں پر پیٹ کے بل رینگتے رہو گے! تمہاری سلونی رنگت والی بیویاں تمہارے بے روح فن کو کوستی ہوئی دق اور سل کا شکار ہو کر خون تھوکتی رہیں گی! ——
اور تمہاری جیبیں پھر بھی خالی رہیں گی! —

پشت والی میز پر بیٹھے ہوئے دونوں بزنس مین اب بھی باتیں کر رہے تھے۔ اپن کا تو بھیجا کھراب ہو گیا ہے۔ یہ مارشل لا کب کھتم ہو گا؟

اور اس کا ساتھی کہہ رہا تھا۔

"او باجو والی بلڈنگ میں جو سیٹھ رہتا ہے نا، اس پر حکومت کا لوگ آٹھ لاکھ جرمانہ کر چکا ہیں ۔ سالا ہم سے بہت دنگا کرتاں تھاں ۔ ہم اس سے بولتا تھا سیٹھ؟ یہ جو تم گریبوں کے کھون سے چراگ جلاتا ہے نا: یہ سالا چراگ جاستی دیر نہیں جلیں گا ۔ ہم اسے بولا تھا یہ دھندا تمہیں برباد کر دیں گا۔"

پہلا بزنس مین خاموش تھا لیکن تھوڑی دیر بعد اس نے کہا

"سالا اپن لوگ بزنس چھوڑ دیں گا سمجھا؟ ہم بزنس کرے تو حرامی! بلیک نہیں تو بزنس نہیں، اور بزنس نہیں تو ہم سیٹھ نہیں! —— تم بھی نہیں۔ پیسہ بھی نہیں ۔ گرج ہر چیز کھلاس ۔" پھر وہ پوری طاقت سے چلایا۔

"بیرا۔ ڈبل چائے کا بولو ۔ کھوب گرم ۔"

ایک ناکام فلم پروڈیوسر —— دو بزنس مین —— چند گمنام شاعر

بھاگتے ہوئے بیرے، گزرتا ہوا وقت اور باہر سڑکوں پر اُمنڈتا ہوا روشنیوں کا سیلاب۔۔ کاریں ۔ بسیں ۔ ہنگامے ۔ آدمیوں کے ہجوم!

اُس نے ریڈ لمپ کا سگریٹ جلا کر ایک لمبا کش لیا۔

"کیا زندگی کے دامن میں یہی کچھ ہے؟ کیا زندگی ...؟ ہمیں یہی کچھ دے گی؟ وہ روشنیاں جن کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ وہ ہنگامے جن کا تعلق سماج کے کرب سے ہے۔ وہ فلم پروڈیوسر جو رقص کی پاکیزگی کو جنس کی اُتھلی نالیوں میں ڈھکیل دیتا ہے۔ وہ شاعر جو وفا کے شبستانوں کی تلاش میں آلام کے صحراؤں میں بھٹک رہے ہیں! اور —— جن کی سانولی رنگت والی بیویاں سوتے جاگتے گھونگھٹ کی اوٹ میں جل رہی ہیں! —— اے روشنیوں کے شہر! یہ سب کیا ہے؟ ——

اور پھر اُس کے شعور کی لا انتہا گہرائیوں میں اس کے سوال کا جواب ایک ایسی کرن بن کر جاگ اٹھا جو تکلم کے آب گینوں کو جلا دیتا ہے ——

جو دن جو گذر چکے ہیں —— ان سے وہ کہیں بہتر ہیں جو ماہ و سال کے سانچوں میں ڈھلیں گے! —— ماضی کی سڑی گلی لاش کو وقت کی خوراک بن جانے دو! —— حال اور مستقبل — آپ اُس کے جنازے کو کاندھا دے کر قبر کی تاریکیوں کے سپرد کر دیں گے!! ——

وہ سوچتا رہا۔ گذرے ہوئے دنوں کی تلخی یاد کرنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم اس کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچیں۔ مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں بنانے والا گنجا پروڈیوسر آرٹ کے نام پر عوام کو فریب دینے سے قاصر

ہے۔! بزنس مین، بلیک ختم ہو جائے پر پوری انسانیت سے برہم ہے!
—— مدقوق شاعروں کا بوسیدہ فن یونان کے کسی بوڑھے فلسفی کی طرح ایتھنس کی آباد شاہراہوں پر دم توڑتا جا رہا ہے —— اور یہ جو سڑکوں پر مصنوعی روشنیوں کے سیلاب رقصاں ہیں۔ یہ جو ہنگامے اپنے لامتناہی شور کو برقرار رکھے ہیں اِن کے سیلِ بیکراں میں اب ایک ہم آہنگی آتی جا رہی ہے۔ ایک شعوری موڑان کے نزدیک آچکا ہے۔ نئے انسان کا وجدان اِن کا سراغ پا چکا ہے۔

جب وہ یہ سب کچھ سوچ رہا تھا تو بزنس مین کہہ رہا تھا۔

"مارشل لا ایک دم کھرا کام ہے! —— گریب ہوتا جارہا ہے، سالا جاگیردار اور بڑی بڑی زمینوں والا آدمی ایک دم قلاش ہوتا جارہا ہے؛

"بیرا! ایک سنگل بریانی۔"

اُسے محسوس ہوا جیسے کھیت آزاد ہو گئے ہیں۔ ان گنت دہقان ٹیکسلا کی مردہ تہذیب سے بھی پہلے کے جاگیرداری نظام کی موت پر خوش ہیں ——

—— گنجا پروڈیوسر —!

—— چند مدقوق شاعر! —— اور

—— دونوں بزنس مین کبھی —— اٹھ کر جا چکے تھے —— اور باہر سڑکوں پر روشنی کا اُمنڈتا ہوا سیلاب رقصاں تھا۔

اُس نے آپ ہی آپ کہا ——

کتنے جلوے کتنے طور

اے روشنیوں کے شہر؟ ——————

(۲)

اور اُسی رات روشنیوں کے شہر میں کیفے ڈی پیرس کا بڑا ہال انگریزی موسیقی کی مسحور کن دھنوں سے گونج رہا تھا۔ زندگی رنگ و بو کے طوفان میں غرق تھی —— نغمے، گیت، رقص، اور دھنوں پر تھرکتے ناچتے، جھومتے جسم —— جاذبِ نظر اور دل کش عورتیں ۔ طرح دار مرد، رومان، قہقہے، گداز سینوں کا ابھار —— نیم برہنہ لچکتی کمریں! —— تیز روشنیاں حسن ہی حسن!

کیفے ڈی پیرس کے بڑے ہال میں رقص جاری تھا۔

زندگی ناچ رہی تھی ماحول ناچ رہا تھا —— اور شوخ ورنگین روشنیوں کے فوارے فضا میں پھوٹ رہے تھے ..... یہاں نہ تو کوئی ناکام فلم پروڈیوسر تھا اور نہ وہ ناقدری شاعر! جن کی سلونی رنگت والی بیویاں فاقے کرتی ہیں، گھونگھٹ کی اوٹ میں جلتی ہیں، آہیں بھرتی ہیں اور پھر —— خون تھوکتے ہوئے مرجاتی ہیں ——!

"زندگی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ آرکسٹرا کی نغمہ سرائی پر رقص انتہائی کمال کا مظاہرہ کر رہی تھی —— یہاں ہر رات یہی کچھ ہوتا ہے —— عشرتوں کے طوفان آتے ہیں۔ شراب کے چھلکتے گلاس، سرخ ہونٹوں کی دہکتی ہوئی آگ کا لمس پا کر پگھل جاتے ہیں —— آج رات بھی یہاں دلوں کی گداز تشنگی شراب کی بوتلوں میں غرق تھی ..... ہر رات یہاں

نغمات انگڑائیاں لیتے ہیں ۔ بربط وقت کے تار بجتے ہیں اور نیم برہنہ شانوں، لچکتی کمروں اور سڈول پنڈلیوں کا مینا بازار سج جاتا ہے —!
اور جب سنگیت کے مدھر دیپ نرمل روشنیوں کا روپ دھار لیتے ہیں تو مینا بازار کی ہر دکان گاہکوں کے ہجوم سے اٹ جاتی ہے ۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ماہتابیاں چھوٹنا شروع ہو جاتی ہیں — سپید واجلی پنڈلیاں موسیقی کی دھنوں پر تھرکنا شروع کر دیتی ہیں ۔

"آپ سے مل کر مجھے ایک روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے ۔"

"اور مجھے بھی" — کرنل قصار بایزید نے کہا — "آج سفارت خانے میں آپ سے سرسری سا تعارف ایک اجنبی ترک کی رنگین رات کا حاصل بن گیا —"

"ترک کس قدر پیارے انسان ہوتے ہیں! —"

نغمے کی دھن تیز ہو گئی — اور کرنل قصار بایزید کے مضبوط بازوؤں کی گرفت مس رابرٹ ٹیل کی نیم برہنہ کمر کے گرد اور سخت ہو گئی —!

"زندگی کس قدر خوبصورت ہے؟"

"آپ کے رقص کی طرح — میرا مطلب ہے آبنائے باسفورس میں اٹھتی ہوئی اُس موج کی طرح جو آسمان کی بلندی کو پیار کر لینا چاہتی ہے —"

"شکریہ کرنل قصار! —" رابرٹ ٹیل کے خوش نما ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا — "آپ باتیں کرنا خوب جانتے ہیں ۔"

"مزید شکریہ ——" کرنل تصار انکساری کے ساتھ بولا ——
کاش آج کی رات قدرے طویل ہو سکتی —— ہمارے رقص کا ہر زاویہ رشتہ لمحات کی ابدی کڑی ثابت ہوتا۔"

"ترک مہربان انسان ہوتے ہیں ——" ناچتے ہوئے اُس نے کرنل کے مضبوط اور چوڑے شانوں پر اپنا سر رکھ دیا۔

"غالباً آپ بہت زیادہ جذباتی انسان ہیں —— ہم امریکن لڑکیوں کو جذباتی مروہت پسند ہوتے ہیں! —— لیکن لندن کی عورتیں مرد کے جذبات کی ذرا بھی قدر نہیں کرتیں ——"

کرنل تصار —— ایک ہزار معافیاں —— اُمید ہے میری صاف گوئی کو آپ پسند کریں گے —— ترک تصنّع پسند نہیں ہوتے

انگریزی موسیقی ایک پُر شور جذباتی دُھن بجا کر خاموش ہو گئی —— رقص کی بساط اُلٹ گئی —— لچکتی ہوئی نیم برہنہ کمریں مضبوط بازوؤں کی گرفت سے آزاد ہو گئیں —— وہ دونوں ایک خالی میز تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

کیفے ڈی پیرس کا ہال آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا —— کرنل نے اشارے سے بارمین کو بلایا —— پچاس سالہ ٹھنگنے قد کا سلیم فام بارمین میز کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا

کرنل نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور ٹھنگنے بارمین سے وہسکی اور سوڈا لانے کو کہا۔

بار ہین کا لہجہ مشرق کے عام انسانوں کی طرح کرخت تھا۔

"یس سر ۔۔۔! وہسکی اور سوڈا ۔۔۔" اُس نے کرنل کے جملے کو دُہرایا پھر اُس نے رازدارانہ لہجے میں کہا کراچی کی آب وہوا وہسکی کے لئے موزوں ہے۔ بار ہین اپنا مشورہ دے کر چلا گیا ۔۔۔

"بیچاری مسیح کی گمنام بھیڑ! ۔۔۔۔۔" رابرٹ ٹیل کھل کھلا کر ہنس پڑی ۔ جہالت کا تاریک براعظم! عجیب سا نقطہ! ۔

بار ہین وہسکی اور سوڈا لے کر واپس آگیا ۔

"سر! یہ گلاس جو میرے ہاتھ میں ہے یہ سان فرانسسکو کا بنا ہوا ہے اور اس چھوٹے سے جام کو آپ اوک لینڈ کا بنا ہوا تصور کرلیں"

کرنل تصار نے بار ہین سے کہا۔

"لیکن میں تو انگور ے کا ہوں ...... اس بڑا عظم سے اُدھر ایک اور بڑا عظم ہے ۔ ایک نیلگوں سمندر ہے ۔۔ اور وہاں میرا ملک ہے"

مس رابرٹ ٹیل مسکرا کر بولی

"میں کیلی فورنیا کی ہوں ۔۔۔ تین سال سے میرا قیام کراچی میں ہے ۔۔ کیلی فورنیا ۔۔ جہاں کلو راٹا ؤن ہے میری پیدائش کی جگہ ..."

"تمہارا وطن ؟" کرنل نے بار ہین سے مزید دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

سیہ فام ٹھگنے بار ہین کا چہرہ اُداس ہوگیا! ۔۔

"میرا کوئی وطن نہیں ہے ..... نہ ہندوستان نہ پاکستان ، یورپ وامریکہ بھی نہیں ! بار ہین کی آنکھوں میں طوفانی رات کے اندھیرے

پھیلتے نظر آرہے تھے ___ معاف کرنا سر! افریقہ کا کالا انسان کب کسی ملک کو اپنا کہہ سکتا ہے؟" وہ مایوسانہ انداز میں بول رہا تھا ___ "ہم جاہل ہیں ___ وحشی ہیں ___ گورے لوگ ہمارے آقا ہیں ___ سر! اِن کے آنے سے ہمارے تاریک براعظم کی قسمت جاگ اُٹھی ___ مگر ہماری قسمت ہمیشہ کے لئے سو گئی! ___"

عجیب سا نقطہ ___ دھندلی لکیر ___ مسیح کی گمنام بھیڑ ___ تاریخ کا خونی موڑ ___ کیفے ڈی پیرس کا روشن ہال ___ کرنل قصار بایزید بارمین سے بات کر کے جھینپ سا گیا ___ رابرٹ ٹیل کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں اُبھرتی دیکھ کر وہ سیاہ فام انسان چلا گیا ___

"ڈارلنگ!"

"مجھے ڈارلنگ مت کہو ___" رابرٹ ٹیلی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی ___ پیشانی سے ساری شکنیں جاتی رہیں ___

"بہت اچھا ڈارلنگ ___"

پھر وہ دونوں ہنس دیئے ___ باسفورس کی موجیں اوک لینڈ کے خوبصورت آہنی پل کے دروازوں سے گذرنے لگیں ___

"بارمین تو اچھا خاصا فلسفی تھا ___ نرا سیاسی انسان ___"

کرنل نے وہسکی گلاسوں میں اُنڈیل دی ___

چھلکتا ہوا سان فرانسسکو نزک کرنل کے لبوں تک آ گیا ___ اور خوشنما جام اوکلینڈ کے اُفق سے پھوٹتی ہوئی کرن بن کر رابرٹ ٹیل کی

توجہ کا مرکز بن گیا۔

باہر سڑک پر ابھی تک روشنیوں کا کارواں اپنی آن دیکھی منزلوں کی طرف رواں دواں تھا ـــــ مگر یہ کون سوچتا کہ ان روشنیوں کے پس منظر میں کتنی تاریکیاں تھیں ـ لامحدود تاریکیاں! ـــــ ٹھٹھرتے اور سیہ فام بارمین کے افسردہ چہرے کی طرح!۔

"مس رابرٹ ٹیلی!"

کرنل اس کی خوبصورت انگلیوں سے کھیلتے ہوئے بولا

"کتنی عجیب بات ہے...... کیلیفورنیا؟ اوکلینڈ؟ - ایک براعظم؟ کراچی اور کہاں میری ملازمت کا مستقر؟ ـــــ آبنائے باسفورس یا اناطولیہ کی خشک اور ویران پہاڑیاں! ـــــ زندگی نے ہم دونوں کو کس انداز میں یکجا کیا ہے؟ ـــــ ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے ـــ ناآشنا! ـــ دو مختلف سمتیں، مخالف دھارے! ـــ اس نے توقف کے بعد کہا

مسکراہٹ مجھے بہت پسند ہے ـــــ آج کی رات آپ اسی طرح مسکراتی رہیں ـــــ" کرنل تصار نے گلاس میں سوڈا انڈیلتے ہوئے رابرٹ ٹیل کو دیکھا ـــــ گزشتہ جنگ سے لے کر آج تک میری عمر کی اکثر و بیشتر راتیں خندقوں میں بسر ہو رہی ہیں! ـــــ نہ معلوم کب تک مجھے اناطولیہ کی پہاڑیوں میں موت کے ہلاکت آفریں سناٹوں کو اپنا کر پیٹ کے بل رینگنا ہو گا؟ ـــــ"

رابرٹ ٹیل نے اپنی خشک زبان ہونٹوں پر پھیری —— کرنل نے دونوں گلاس لبریز کر دیئے۔

"آپ بور تو نہیں ہو رہے ہیں؟ —"

"نہیں نہیں کرنل! —— میری روح عرصہ سے ایسے انسان کی متلاشی تھی —"

رابرٹ ٹیل نے وہسکی کا گلاس منہ سے لگا لیا —— کرنل جذباتی ہو چکا تھا اور وہ بھی کچھ سنجیدہ ہو گئی تھی —— ادائے سپردگی غائب تھی اور ہونٹ چالاک تمنائی پر مائل تھے۔

"اناطولیہ کی پہاڑیوں میں کھدی ہوئی خندقوں پر چھائے ہوئے سیال اندھیرے میری حیات کی جدوجہد کا حاصل ہیں! —— حکومت مجھ پر اعتماد کرتی ہے"

وہ دلچسپی سے اس کی باتیں سُن رہی تھی۔

"ہر شخص اپنے وطن اور حکومت سے محبت کرتا ہے —— مصطفیٰ کمال، عصمت انونو، عدنان مندریس ہمارے رہنما ہیں —— اور میں تو پھر ایک ذمہ دار فوجی ہوں جسے ایک خاص مشن کی تکمیل کے لئے حلیف ممالک کے دورے پر بھجوایا گیا ہے —"

حبشی بار مین نے خالی بوتلوں کی جگہ نئی بوتلیں میز پر رکھ دیں —— رابرٹ ٹیل کی مسکراہٹ میں طنز شامل ہو گیا اور عجیب سا نقطہ، عجیب سی لکیر، مسیح مقدس کی بے نام بھیڑ، آدمیوں کے ہجوم اور پھیلی ہوئی میزوں

کے درمیان غائب ہوگئی! ـــــ سان فرانسسکو کا بنا ہوا گلاس پھر لبریز ہو گیا ـــ کیلیفورنیا کا پُل شراب کے طوفان میں غرق تھا! ـــ

"نہیں معلوم کراچی میں میرے قیام کی عارضی مدت کیا ہے؟ کچھ دنوں بعد میں امریکہ جاؤں گا نیویارک، واشنگٹن، آپ کے شہر اوکلینڈ۔"

وہ سانس لینے کے لئے رُکا۔

ممکن ہے میں یورپ بھی جاؤں، مگر یہ طویل دورہ ـــــ بّراعظموں کا یہ فاصلہ۔ سمندروں اور فضاؤں کی یہ مسافت ایک دن ختم ہوجائے گی ـــ مجھے اُن بے کیف اور ویران پہاڑیوں کے دامن میں کُھدی ہوئی خندقوں پر چھاتے ہوئے سیال اندھیروں کی طرف لوٹ جانا ہوگا ـــ جہاں ہزاروں ترک سپاہی دور اُفق پر نظریں گاڑے اپنے ان دیکھے دشمن کے انتظار میں ہیں! ـــ"

رابرٹ ٹیل نے اپنی دونوں کہنیوں کا زاویہ بنا کر کرنل کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں ـــ بایزید کی کُشادہ پیشانی پر غم کی دھند چھا رہی تھی!

"ہم سب کو اپنا دوست سمجھتے ہیں ـــــ کرنل نے گہرا سانس لیا سچا ترک اپنے دشمن سے بھی پیار کرتا ہے ـــ انسانوں سے محبت کرنا ہمارا ایمان ہے ـــ"

حبشی بارمین میز کے قریب سے گذر رہا تھا ـــ کالے تمدن کا ٹوٹتا ہوا نشہ! وحشی تہذیب کی رکتی ہوئی سانس! دھندلی لکیر! ـــــ

رابرٹ ٹیل اسے دیکھکر پھر مسکرا دی ـــ بارمین نے اپنی نظریں

نیچی کر لیں۔۔۔

"میری باتیں کس قدر غیر رومانی ہیں"

رابرٹ ٹیل نے ہولے سے انگڑائی لی ۔۔۔ "یہ ہوٹل مشرق کے لذیذ کھانوں کی غالباً قبلہ گاہ ہے"

"کبھی کبھی میں اسی طرح بہک سا جاتا ہوں" وہ اصل موضوع کی طرف آ گیا ۔۔

"ہر ترک کو جنگ سے شدید نفرت ہے ۔۔۔ وہ زمین کے کسی بھی حصے میں لڑی جائے ۔ روس، امریکہ، ہندوستان، پاکستان، جنگ بہر حال جنگ ہوتی ہے جس میں لاکھوں انسان مارے جاتے ہیں، ہڈیوں اور کٹے پھٹے جسموں کے انبار ملبے کی صورت میں دُور دُور تک بکھر جاتے ہیں"

بایزید نے اپنی بات جاری رکھی۔

"کیفے ڈی پیرس کا رنگین ماحول میدانِ جنگ کے ماحول سے مختلف ہوتا ہے ۔۔۔ وہاں روح کی گہرائیوں پر جو سکوت طاری رہتا ہے اُسے انگریزی جاز کی موسیقی کبھی نہیں مٹا سکتی !۔۔۔

متمدن شہر کا افسوں !۔۔۔ سامنے سڑکوں پہ روشنیوں کے قمقمے جل رہے تھے ۔ تجارتی کمپنیوں کے مونوگرام کبھی تابندہ ہو جاتے تھے اور کبھی تاریک ۔۔۔ تیز رفتار موٹریں روشنیاں بکھیرتی آ جا رہی تھیں ۔۔

بایزید ماحول سے قطعی بے نیاز تھا ۔۔

"آپ نے جنگ سے پہلے اور بعد کا المناک ماحول دیکھا ہے؟ ایک تلخ تر سناٹا! مجروح انسانوں کے خون میں رنگی ہوئی زمین؟ —— قیمہ قیمہ جسم؟ —— ہڈیوں کے ڈھیر۔ ادھ جلی لاشیں، اور دور و نزدیک چھایا ہوا پُرہول سکوت: جو سنسناتی ہوئی گولیوں اور وزنی ٹینکوں کی پُر شور گڑگڑاہٹ سے ہی ختم ہو سکتا ہے! ۔"

"میں اُس وقت لندن میں تھی جب جرمن یورپ کے بیشتر شہروں کو خاک کا ڈھیر بنا چکا تھا" رابرٹ ٹیل نے پہلی مرتبہ تفصیل سے گفتگو میں حصہ لیا۔

"لندن پر بارش کی طرح بم برس رہے تھے اور ہم ایک ہفتے تک متعفن پناہ گاہ میں دم سادھے پڑے تھے! —— ان دنوں زندگی کا ہر سانس امتحان ثابت ہو رہا تھا —— دھماکے —— آگ —— خوف —— خطرہ۔ اعصابی تھکن، جنگ کا جنون، لندن کے انسان مر رہے تھے۔ چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں —— میں ان مُردہ جسموں میں گھری رہی، پلک سے پلک نہ لگی —— پھر میں عادی ہو گئی —— موت سے جب تک انسان کا سامنا نہ ہو وہ اس وقت تک اس سے خوف کھاتا ہے ۔"

رابرٹ ٹیل خاموش ہو گئی —— کرنل نے اسے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آبنائے باسفورس کے کنارے آباد ہونے والی قوم کئی مرتبہ اس سکوت کو اپنا چکی ہے۔ کبھی عظیم تر سلطانوں کے حرم کی حفاظت

کے لئے ۔۔۔ کبھی جنگِ آزادی کے لئے ہم نے کبھی اقوامِ متحدہ کے پرچم تلے موت کی خاموشی کو گلے لگایا ہے! ۔۔ کوریا کی جنگ کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے۔ میں اُس فوجی دستہ کے ہمراہ تھا جو جنگ کے میدانوں میں کام آچکا ہے ۔۔

بایزید نے بٹلر کو اشارے سے بُلایا ۔۔۔ بٹلر نے مینو آگے بڑھا دیا میرے لئے تلے ہوئے گوشت کے چند قتلے اور مرغ کا آب جوش ۔۔۔!

ـــ ہال آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔

باہمی گفتگو کی دھیمی دھیمی آوازیں، سگریٹوں کا دھواں، اور برابر والی میز پر بیٹھا ہوا پارسی جوڑا ۔۔

رابرٹ ٹیل نے گوشت کا قتلہ کانٹے میں پروتے ہوئے کہا

"کیا آپ بات پوری نہیں کریں گے؟ ۔۔۔۔۔ وہی کوریا والی بات جو اس کھانے سے کہیں زیادہ مزے دار ہوگی ۔۔"

کرنل قصار نے مرغ کا آب جوش پیتے ہوئے باتوں کا سلسلہ چھیڑ دیا

"زندگی کی طویل شاہراہ پر اب تک کتنے چہرے ملے ہیں: شاداب افسردہ، اجنبی، اور جانے پہچانے چہرے! ۔۔ لیکن کتنے چہرے دیکھتے ہی دیکھتے تاریکیوں میں گم ہو گئے ۔۔ ۔۔۔۔ آج صرف اُن کی قابلِ احترام یادیں ہیں جو احساس کے سُلگتے ہوئے دامن پر شبنم بن کر برس رہی ہیں۔

رابرٹ ٹیل نے انہماک کے عالم میں سر کو جنبش دی۔

"میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا ۔۔۔ کوریا کا خونی محاذ، جنگ کے

مہیب بادل اور آگ اور خون کے اس سمندر میں ایک دبلا پتلا میجر جس کے جسم میں اُس آرٹسٹ کی روح تھی جو رنگوں سے کینوس کے ٹکڑے پر اپنے فن کو دوام بخشتا ہے ۔۔ میجر ازدہم" وہ قسطنطنیہ کے کسی دیہات میں پیدا ہوا تھا ۔ الخمیر وں کے جھنڈ میں اُس نے اپنے بچپن کو رخصت کیا تھا ۔ اسی بستی میں اس کی محبوبہ بھی تھی ۔۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے ۔ اُس کے عجیب تاثرات تھے ۔۔۔ اُس کے نزدیک زندگی گوتم کا خواب تھی، کرشن کی بانسری کی مدھر لے تھی، مسیح کا مقدس فرمان تھی، طائف کی وادیوں میں کھلنے والا پھول تھی ۔۔

کھانا ختم ہو چکا تو بٹلر خالی برتن اُٹھا کر چلا گیا ۔۔ قلیل سے وقفہ کے بعد بایزید پھر بولا ۔

"اُس نے زندگی کو اس سے زیادہ کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی"

"کاش ہم بھی اس طرح سوچ سکتے"

"ہاں آپ ٹھیک کہتی ہیں 'اس انداز میں اگر سوچ سکتے تو دنیا دوسری بار ہیروشیما کی طرح کسی ہلاکت خیز تباہی کے دہانے پر کھڑی نظر نہ آتی ! ۔۔"

رابرٹ ٹیل نے سگریٹ سلگا کر اپنا سر کرسی سے لگا لیا

"مگر مشکل تو یہ ہے ہم اس انداز میں کبھی سوچ ہی نہیں سکتے! ۔ میجر بھی تو یہی کہتا تھا ۔۔ یہی کچھ ۔۔ تو میں ایک دوسرے سے لڑتی کیوں ہیں ؟ وہ اکثر مجھ سے باتیں کیا کرتا تھا، سیاسی معاہدے ۔

بین الاقوامی سازشیں، سیاست کی سرد جنگیں، اضطراب، کشمکش، آخر یہ سب کیا ہے — سنو کرنل وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہتا، تم مجھ پر ہنس رہے ہو، ہنسو! لیکن جب میں کسی کو فوجی یونیفارم پہنے دیکھتا ہوں تو مجھے دنیا کے ہر شہر کا مستقبل ہیروشیما کی طرح تاریک نظر آتا ہے — خون، ہڈیوں کے ڈھیر، متعفن لاشیں — صدیوں سے ہمارے جسم بین الاقوامی رقابتوں کے جہنم میں جل رہے ہیں — اور جب وہ یہ باتیں کرتا تو اس کے اور اپنے درمیان میں ایک طرح کی جذباتی مساوات پاتا تھا۔ وہ مساوات جو اُس کے بعد ناممکن ہوتی تھی۔"

"کوئی ہلکی سی شراب —" پستہ قد بارمین ادب سے جھک کر بولا
"کچھ بھی لے آؤ"

بارمین چلا گیا۔ رابرٹ نیل کی نیلی آنکھوں میں شرارت چمکنے لگی۔ پھر اس نے جن کے دونوں گلاس لے کر میز پر رکھ دیئے۔ صبح کی بے نام بھیڑ غائب ہو گئی!۔

"میں اُسے بڑی شدت سے یاد کر رہا ہوں" اُس نے رابرٹ نیل کے خوش نما ہاتھوں کو چوم کر کہا —— "ایک حسین جسارت مرحوم دوست کی بے رحم یاد کے نام"

"جاؤ معاف کیا"

"شکریہ —— یادیں بڑی بے رحم ہوتی ہیں — میں کچھ کہہ رہا تھا — ہاں خوب یاد آیا۔ ہیجر بلی ندھم کہا کرتا تھا ہم انسانیت کے سبق کو بھول سے

گئے ہیں۔ کاش کوریا کے میدان ہمارے لوک گیتوں کی دل کش تانوں سے معمور ہوتے! — مگر یہ بند وقیں — پھر وہ دور اُفق پر نظریں گاڑ کر کہتا۔ میں ایک فوجی ہوں .... مجھے یہ بھی نہیں معلوم نپولین کی کتنی بیویاں تھیں — مشرق و مغرب کے لوگوں میں کیا اختلافات ہیں؟ مجھے مطلق خبر نہیں۔ امریکہ کے چیف آف اسٹاف کا نام کیا ہے یا ہیز اٹل کے رتھوں میں بیٹھ کر موت ہمارا تعاقب کر رہی ہے! — اور اب ہم قسطنطنیہ کو اُصاک کو، شاخِ زریں کو، خلیج باسفورس کو، جھیل وان کے علاقے کو کبھی نہیں دیکھ سکیں گے! — مگر میں ان تمام باتوں کو ایک محض ایک استہزا سمجھتا ہوں! میرے لئے دنیا کا ہر شہر انگورا ہے جھیل وان کے سینے پر چلنے والی کشتیاں ہر جگہ ہیں — کاش ہم ہڈیوں کے ملبے اور قیمہ قیمہ لاشوں کو دیکھنے کے بجائے اثری اور مابعد اثری آرٹ کے دل کش نقوش دیکھتے — اگر شیطان بھی اس موضوع پر کچھ کہہ سکتا تھا تو ہمیں اس کی بات بھی سننا چاہیے تھی "

میں اُس کی ذہنی زندگی میں شریک ہونے سے قاصر تھا۔ کتنی عجیب بات ہوتی۔ جنگ کی اسکیمیں بنانے کے بجائے میں شعر کہنے لگتا۔ یا آرٹ کے دل کش نقوش دیکھنے کے لئے اجنتا کے غاروں کی گہرائی میں اُتر جاتا۔ اور بدھ، کرشن، مسیح، یا ایشیا کے کسی روحانی اوتار کی طرح دنیا کو تیاگ کر قدیم تصورات کی زمہریر جنتوں کی تلاش میں نکل جاتا — اور جب تاریک رات کے آخر حصے میں چاند آسمان پر اپنی درد انگیز روشنی بکھیر رہا تھا اور

ہم لوگ ناہموار خندقوں میں پیٹ کے بل لیٹے ہوئے گذرتے لمحوں کا شمار کر رہے تھے! — وہ حسب عادت آہستہ سے بولا۔

"کرنل قصار بایزید —— آج کی رات کس قدر بھیانک ہے — ستی ہونے والی ہندو عورت کی طرح، جیسے کائنات کا لٹا لٹا سہاگ فریاد کر رہا ہے!"

"آج تم فلسفی معلوم ہو رہے ہو — میں نے میجر سے مذاق کیا۔

"یہ بات نہیں کرنل —"

برابر کی خندق میں ایک ہلکا سا شور اٹھا غالباً دو سپاہی آپس میں لڑ رہے تھے جنھیں خاموش کرا دیا گیا۔

"تم اسے میری بزدلی نہ سمجھنا —کیا یہ سچ نہیں ہے ہمارے کتنے ساتھی موت کے نامراد ویرانوں میں کھو چکے ہیں"

رابرٹ نیل نے انگڑائی لے کر گلاس خالی کر دیا — میں جنگ کے اس خلاصے کو ہمیشہ یاد رکھوں گی" کرنل نے اس کی مخروطی انگلیاں ہونٹوں سے لگا کر چھوڑ دیں —

میجر نے خندق چھوڑ دی — وہ ٹہل رہا تھا۔ آسمان کے نامعلوم گوشے پر چاند ایک کفن بردوش نازنیں کی طرح ماتم سرا تھا —— دم توڑتی روشنی، دھواں۔ ازل و ابد کے راستے تاریک تھے"

"کرنل! میجر یازدہم نے دور خلا میں دیکھتے ہوئے کہا کیا تمھیں مرنے والوں کی یاد کا احترام مقصود نہیں —— ہم نے حادثوں میں گھر کر بھی امن و سلامتی

کی صبحوں کو سلام کرنا نہیں سیکھا ہا' اُس نے پلٹ کر مجھ پر نظریں گاڑ دیں اور میری روح ' میرا ذہن ' میرا ضمیر اُس کے سامنے دو زانو ہوتے نظر آنے لگے۔۔۔میں نے اُسے سختی سے ایسی باتیں کرنے سے منع کیا۔

وہ ایک عزم کے ساتھ بولا

"تم میرا کورٹ مارشل کر سکتے ہو' میرا جرم یہی ہے کہ میں زندگی سے پیار کرتا ہوں ' کرنل! میں تم سے ان تباہ کن میزائلوں اور ایٹم بموں سے شدید نفرت کے اظہار کا حق مانگتا ہوں۔ ایک ایسا حق جو عالمی امن وسلامتی کا ضامن بن سکے۔"

وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔ مرنے والوں کی مقدس روحوں کی قسم یہ بندوق اب کبھی آگ نہیں اُگلے گی! ۔۔۔ وہ فاتح کی طرح ٹہل رہا تھا۔ اور میں اس کے مطالبہ پر غور کر رہا تھا۔

عارضی صلح کے امکانات بہت زیادہ روشن ہیں تم رخصت پر گھر چلے جانا ۔۔۔میں نے اُسے تسلی دینی چاہی ۔ تمھارے اعصاب تھک گئے ہیں۔

اُس نے تلخ ہنسی ہنس کر کہا ۔۔۔" یہ تو بے روح اخلاق کی کھوکھلی داروائیں ہیں ۔ یہ وہ انفرادی تسلیاں ہیں جو ایک زندگی کو مطمئن کر سکتی ہیں۔ ساری دنیا کے انسانوں کو نہیں! ۔۔۔ کبھی بھول کر بھی یہ نہیں سوچا گیا جن شاہراہوں پر سفر کیا جا رہا ہے وہ بلندی سے پستی کی طرف آتی ہیں! ۔۔۔

۔۔۔ ہم ڈھلوانوں پر سفر کرنے کے عادی ہو گئے

ہیں — زندگی کے ہر سطح پر جنگ، قبرص کے حصول کے لئے جنگ، مشرقی و مغربی برلن کی فضا میں "سویز کے آباد کنارے" افریقہ کے گھنے جنگل، زرد چینیوں کے گنجان شہر، انسان کا جذبۂ نفرت جنگ کا اعلان بن کر گھٹا کی طرح کہاں نہیں برس رہا — محبت کے سمندر خشک ہو چکے ہیں، کہنے کو آج ہم دشمنوں سے نبرد آزما ہیں — مگر کیا اس جنگ اور ایسی کئی جنگوں کے بعد ہماری بہیمانہ جبلتیں بدل جائیں گی؟ — دشمنوں کو عظیم شکست ہو جانے پر ہمارے بھار بندوقیں توپیں اور بموں کے ہلاکت خیز دھماکوں کی نئی تاریخ کیا ہوگی؟ —"

میں اس کی بات کا جواب نہیں دے سکا۔

"یہ تلخ اعتراف غالباً تم کبھی نہیں کر سکتے تھے کہ پھر ہماری صدیوں کی وحشیانہ جبلت، بہیمانہ خود سری، مملکتوں، جمہوریتوں، اور سلطنتوں کے زیر سایہ پروان چڑھنے والا خواہشوں کا مہیب دیو دشمنوں کی موت سے مایوس ہو کر دوستوں کا گلا دبا دینے سے بھی گریز نہیں کرے گا — کھیت، شہر، اور یہ آبادیاں ہماری دوستی کی آگ میں جلنے سے بچ سکیں گی؟"

"زبان کو بند رکھو" — میں نے بدقت اپنا جملہ پورا کیا۔

وہ آپ ہی آپ کہہ رہا تھا۔

"ترک سب کے دوست ہیں۔ خلیج باسفورس کے کنارے میرا شہر ہے۔ اور اس شہر کے لوگ دنیا کے تمام انسانوں سے محبت کرتے ہیں — میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتا ہوں اگر تم زندہ وطن

لوٹ سکو تو میری بستی میں جا کر میری منگیتر سے کہہ دینا کہ بازد ہم ہمیشہ زندہ رہے گا ۔ مرنے سے پہلے اس نے جاوداں حیات کے راز کو پا لیا تھا اور اس کی بندوق شبنم کی طرح سرد ہو گئی تھی ۔

مہینے کی آخیر تاریخوں کا چاند ۔۔۔ دم توڑتے ستارے، خاموش فضا، حدِ نظر تک ویرانی، اور پھر دھماکے، شور ۔ گڑگڑاہٹ، موت کی سیاہ چادر کا پھیلاؤ دور دور تک جسموں کا قیمہ بکھر گیا ۔ ہڈیاں سلگ اٹھیں، دشمن نے سخت حملہ کیا تھا ۔ میرے قریب دھماکے سے پھٹنے والا گولہ آکر گرا تاریک فضا روشن ہو گئی مجھے میجر کا بے جان جسم نظر آیا گولیوں سے جس کا سینہ چھلنی ہو چکا تھا پھر میرے سینے میں بھی جہنم پھٹ گیا ۔۔۔ جلن ۔۔۔ بیکراں جلن، خون کا فوارہ، ڈوبتا ہوا دل، ہر عکس دھندلا سا گیا ۔ اور جب مجھے ہوش آیا تو میں ہسپتال کے بستر پر تھا ۔ میرے اعضاء مجروح تھے اور ذہن پہ محاذِ جنگ کے پہلے اور بعد والا سناٹا طاری تھا! ۔۔۔ اور آج اتنے دن گذر جانے کے بعد بھی میری وہی حالت ہے ۔۔۔ یہ سناٹا میرا تعقب کر رہا ہے ۔ میں ہسپتال سے صحت یاب ہو کر وطن آ گیا ۔ لیکن وہ سکوت، وادیٔ مرگ کا وہ المناک سناٹا میرے ساتھ رہا! اناطولیہ کی پہاڑیوں سے لے کر کراچی کے ساحلوں تک وہ میرا تعاقب کرتا رہا ہے ۔ اور کون جانے کل جب میں ایک نئے بّرِاعظم کی طرف پرواز کروں گا تو یہ سناٹا کس انداز سے میرا تعقب کرے گا ۔۔۔

"ڈارلنگ! کل میں تمھیں فون کروں گا ۔ کرنل نے افسردہ

مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ میری تمنا تھی ہم دونوں ایک ساتھ سفر کرتے مگر میرے فرائض اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔"

"ایسا ممکن تھا کرنل! — لیکن ایسا ہوتا کیوں؟" رابرٹ ٹیل نے ترشی ہوئی زلف کو ہاتھوں سے سنوارنا چاہا ——— اور پھر خاموشی دونوں طرف خاموشی ———

"کرنل پیارے!" وہ تھوڑی دیر بعد لڑکھڑا کر بولی —" مجھے سہارا دو۔ تمھیں میری مسکراہٹ پسند ہے نا؟ — آج رات میں ہنستی رہوں گی۔ اور اس طرح ہمارے دُکھ خوشیوں سے بدل جائیں گے۔" وہ کھڑی ہو گئی — کیفے ڈی پیرس کے بڑے ہال کی بتیاں بُجھنا شروع ہو گئیں — پارسی جوڑا تبسم بکھیرتا ہوا چلا گیا اور جب بایزید اُسے اپنی باہوں میں لے کر ہوٹل کے کمرے کی طرف جارہا تھا تو رابرٹ ٹیل اُسے بے تحاشہ چوم کر مخمور آواز میں کہہ رہی تھی "تمھارے ذہن پر چھائے ہوئے خنک سناٹے کی دبیز چادر میرے ہونٹوں کے آتشی شراروں سے جل جائے گی۔ پھر تم اطمینان سے امریکہ جا سکو گے — جہاں میری جیسی کئی جوان چھوکریاں اپنے ترک مہمان کا استقبال کرنا خوش قسمتی تصور کریں گی۔"

"ڈارلنگ!" کرنل نے ہولے سے آواز دی — اور اس کے جواب میں اُس نے بایزید کی گردن میں اپنے بازو حمائل کر دیئے — سیڑھیاں ختم ہو چکی تھیں اور کمرے کا دروازہ آ چکا تھا۔

سیال اندھیرے

یہ اندھیرے یہ اندھیروں کا المناک فسون
جن سے لرزاں ہے چراغِ مہ و انجم کا ضمیر

(امتیاز ادیب)

اب نہ تو وہ روشنیاں تھیں اور نہ وہ ہنگامے۔ سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں، دوڑتی ہوئی کاروں کی تعداد میں کمی آ گئی تھی۔ روشن لکیریں خاموش و تاریک فضا میں روپوش ہوتی جا رہی تھیں۔ ایرانی کیفے کا تنومند مالک کاؤنٹر پر دن بھر کی آمدنی شمار کر رہا تھا۔ بیرے خالی برتنوں کو جمع کر رہے تھے، ماحول پر ایک اداسی طاری ہوتی جا رہی تھی، اور کیفے کے دروازے پر کھڑا ہوا فقیر ایک دو مہینے جیل سے احسان کرنے کے نمبر بتا رہا تھا۔ فقیر کے سر اور ڈاڑھی کے بال بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ جسم پر متعفن کپڑوں کی دھجیاں جھول رہی تھیں۔ وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کاؤنٹر کے قریب پہنچتے ہی اس نے اپنی جیب سے چھ پیسے نکال کر پھینک دیئے۔ ایرانی مالک نے تمسخرانہ انداز میں اسے دیکھا۔ لیکن وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

رات خنک ہو چلی تھی ——

تمدنی آسمان پر پھیلے ہوئے تجلیوں کے شگوفے مرجھا چکے تھے — امپریس مارکیٹ کے چوک پر رکشے والے آوازیں لگا رہے تھے - اُسے سعود آباد جانے والی بس کا انتظار تھا - سارا دن شہر کی خاک چھاننے کے بعد وہ اپنے کوارٹر جا رہا تھا - گذشتہ سال حکومت نے دوسرے تباہ حال انسانوں کی طرح ازراہِ ترحم اُسے بھی بغیر کواٹر کا کواٹر عنایت کر دیا تھا - ایک کمرے والا کواٹر — شکستہ سا ویران کمرہ جو کسی جیل کی کوٹھری سے کم ہیبتناک نہیں تھا -

جس روز اُسے یہ کواٹر دیا گیا ہے اُس روز وہ دیر تک فنِ تعمیر کے اس اسٹائل اور اس کے فلسفے پر غور کرتا رہا تھا - اور اب تو اس کوارٹر میں رہتے ہوئے ایک سال ہو چکا تھا - تین سو پینسٹھ دن بارہ مہینے لاتعداد لمحے ! — وہ اس کواٹر میں مقید تھا اور اس کواٹر کی نہ تو چوکھٹیں تھیں نہ کواڑ — اور جس کا کمرہ جیل کی اذیت ناک کوٹھری دکھائی دیتا تھا !

سعود آباد جانے والی بس اسٹاپ پر آ کر رُکی ، بس خالی تھی اور جب وہ ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا تو کنڈکٹر چلایا ، جانے دو —

خوفناک گڑگڑاہٹ کے بعد بس روانہ ہو گئی -

" یہ تو کوئی بے معنیٰ بات نہیں - اندھیرے میں بھی ایک طرح کا جمال ہوتا ہے - مگر اس کی حد ہونی چاہیئے " وہ سوچ رہا تھا — ان گنت اندھیرے ، صدہا دائرے ، سیکڑوں نقطے اور سنڈی گیٹ کی بے تحاشہ

بھاگتی ہوئی ناکارہ بس — تھیلا لٹکائے کمزور سا کنڈکٹر، اونگھتے ہوئے مسافر، سڑک کے دونوں جانب پھیلی ہوئی ٹاٹ اور پھوس کی لاتعداد جھونپڑیاں — رہائشی مکانات، زندہ انسانوں کے تاریک مدفن، دق و سل کے جراثیم کی پرورش گاہیں —!

اس نے گھبرا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

یہاں طاعون اور ہیضہ کی مہلک وبائیں پھولتی پھلتی ہیں — یہاں کے رہنے والے گذشتہ کئی سالوں سے عسرتوں کی ویران راہ گزاروں پر رینگ رینگ کر خون تھوک رہے ہیں — اس کی نظروں کے سامنے ایک بڑا سا دائرہ ناچنے لگا — بس فضا میں بے ہنگم سا شور بکھیرتی ہوئی دوڑ رہی تھی — اس نے سوچا، بس کا انجن زبردست دھماکے کے بعد پھٹ جائے، چھت ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے اور دھماکے کی آواز سن کر جھونپڑیوں میں سونے والے غافل انسان تھکی ہوئی نیند سے جاگ اٹھیں — بلند عمارتوں کی بالکنیاں گھبرائے ہوئے مکینوں سے پُر ہو جائیں — اور ویران سڑک پر حدِ نظر تک سائے حرکت کرنے لگیں — اور وہ ان لوگوں سے چلا چلا کر کہے —— بھائیو، بزرگو، بلڈنگ والو، جھونپڑی نشینوں —— آنکھوں کے سامنے ناچتا ہوا دائرہ پھیلتا گیا — پھیلتا چلا گیا!

ہماری آزادی کی عمر پورے بارہ سال کی ہو چکی ہے — ان بارہ سالوں میں جو کچھ ہم پر بیتی ہے وہ دوسری قوموں پر صدیوں میں بھی نہ بیتی ہوگی نعرے بازی — جلوس سازی، وڈیرہ مارکہ، جمہوریت، الیکشن! وزارتوں

کا کرسی توڑ عرصہ — ہر سال ایک سیلاب — مہاجرین کی بربادی — غفار خاں کی سیاست ۔ ادب میں جمود ۔ جمود میں ادب! ۔ حسن عسکری کے مقالے، منٹو کی موت ۔ معمے بازی، اونٹوں کا رقص ۔ اور ان کے گلے میں "اے امریکہ تیرا شکریہ کی تختیاں ۔ سستے اسلامی ناولوں کی بہتات ۔ سیاسی قتل ۔ معاشرتی اغوا، کراچی کی ریس ۔ جھمپیر میں ریل کا اتفاقی حادثہ ۔ اتفاق کے نقصانات ۔ جماعتِ اسلامی کی کھالیں، گشتی شفاخانوں کی رسوم ۔ زرِ مبادلہ کی قلت، بوگس کمپنیاں، کمپنیوں کا فراڈ — یتیم خانوں کی چار سو بیس ۔

شوں، شوں، بس دوڑ رہی تھی — سواریاں اونگھ رہی تھیں — اور اس کی نظروں کے سامنے ناچتا ہوا بڑا سا دائرہ کائنات کو اپنے گھیرے میں لے چکا تھا ۔

سیاسی یتیم لیگ کی معرکے بازی ۔ عوامی لیگ کے پرمٹ، معاشرتی غنڈے ۔ اسمبلی کے مردے ۔ زنگ آلود سیفٹی ریزر سے عوام کی حجامت، سیفٹی ماچس کے کارخانوں میں مزدوروں کی ہڑتال، مولوی عبدالحق کی طلسمی زندگی ۔ صنعتی ترقی کی رفتار، سوئی گیس ۔ چھ پیسے کی پچیس سوئیوں کا عبرت ناک کاروبار! کانفرنسیں، بین المملکتی ناکام مشاعرے، وزیروں کے دورے، عوام کے روزے، پہلا ترقیاتی پنج سالہ پلان ۔ اقتصادی بحران، کراچی کی غریب طوائفوں پر پابندی، سیاست کے طائفوں کی آزادی، جمہوریت کی قتل گاہیں ۔ جاگیرداروں کا محاذ، اسلامی دستور کا مطالبہ، دستور ساز

اسمبلی کا یومِ حشر، غیر ملکی امداد کی بھتات اجنبی چہروں کی یلغار۔
قومی رہنماؤں کی قلت۔ دائرہ سلگ اٹھا۔ سنڈیکیٹ کی بس اپنی منزل
کی طرف بھاگے جا رہی تھی ــــ مدقوق کنڈکٹر چلّا رہا تھا۔

نرسری، محمد علی سوسائٹی، کارساز ــــ

سواریاں اونگھ رہی تھیں اور ایک یوپی کا مہاجر اپنے ساتھ والے
سے کہہ رہا تھا۔

"اللہ بڑا کارساز ہے، یہ تمام دوڑتی ہوئی کاریں اُس کی اپنی بنائی
ہوئی ہیں حضت۔"

دائرہ پھیرتا چلا۔ کاش بس ٹکرا جائے پُر شور انجن ایک دھماکے
کے بعد دور دور تک بکھر جائے۔ وہ پھر تصورات کی بے رنگ وادیوں
میں بھٹکنے لگا۔

عصمت دری کی شرمناک وارداتیں۔ اسلام لیگ کے قدآدم پوسٹر
علامہ مشرقی کے بیلچوں پر مقدمہ، ریڈیو پاکستان کا عصری بخار، بخاری
کی غزل کا ناموزوں شعر۔ ڈاکٹر خان کی موت، اسکندر مرزا کی تختِ
حکومت سے دست برداری۔ اور پھر ایک انقلاب۔ فوجی انقلاب،
اس کا جی چاہا وہ ساری عمر اتنے بہت سارے عنوانوں پر تقریر کرتا ہے
اے بھائیو، پیاری مدقوق بہنو! ۔ پھر وہ سلگتا ہوا دائرہ آسمان بن گیا۔
زمین بن گیا، سعود آباد بن گیا ــــ

اُس نے بس چھوڑ دی۔ فضا اُداس تھی، اور جب اُس نے آسمان

کی طرف دیکھا تو اُسے محسوس ہوا جیسے یہ رات کسی درد کا شجر ہے۔ جس کی ان گنت شاخیں کاغذی کوارٹروں کی ترخی ہوئی دیواروں سے لپٹ کر بین کر رہی ہیں۔ اور دیواروں کی آڑی ترچھی دراڑوں میں جھینگروں اور مچھروں کے ساز نیم دود آلود فضا میں تحلیل ہو رہے ہیں —— اس کا کوارٹر آ چکا تھا۔ اُس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، ڈھلتی ہوئی رات بجھتے ہوئے ستاروں کے دیئے۔ گندگی سے لبی ہوئی ہوا کے جھونکے، اور تاریک کمروں کے فرش سے ابھرتی ہوئی دہشت بیکرانہ —— وہ سر جھکائے اپنے بے کواڑ کے کوارٹر میں داخل ہو گیا۔ جہاں اندھیروں کی غم انگیز صلیب اُس کی منتظر تھی۔ جہاں تنہائیاں اُس کی راہ تک رہی تھیں۔ جہاں بے روزگاری، افلاس، اور نہ ختم ہونے والی یاسیات کا بسیرا تھا۔ جوتے اُتارے بغیر ہی وہ بان کی کھری چارپائی پر گر گیا۔ دن بھر کی تھکان کے بعد ہر عضو درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ سینے میں ہوک سی اُٹھ رہی تھی اور اُس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔

رات کا ایک بج چکا تھا

وہ کروٹیں بدلتا رہا —— پاس پڑوس کے سب لوگ سو رہے تھے روز روز کے غموں نے انھیں بیہوش کر دیا تھا۔ برابر والے کوارٹر پر بھی سناٹا طاری تھا حالانکہ اُسے یقین تھا اُس کے پردوں میں رہنے والا مختصر سا کنبہ ابھی جاگ رہا ہوگا۔ رشیدہ اُس کی منتظر ہوگی۔ بقول صورت رشیدہ۔ جو اس سے والہانہ انسیت رکھتی تھی۔ اُس نے تاریک

کمرے کی کھڑکی شمار وشندان سے اُس نے دیکھا دور اُفق پر آوارہ بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ اگر نفیسہ اس وقت ہوتی تو وہ اُس سے سوال کرتا۔ تمھیں مجھ سے اس قدر والہانہ اُنسیت، گہری وابستگی اور ہمدردی کیوں ہے؟ — جو ناسور تمھاری نفسیات میں پرورش پا چکا ہے کیا اب اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اُس نے ایک طویل سرد سانس بھر کر سوچا — وہ اس سے کہتا تم خود کو برباد کر رہی ہو میری ناکام زندگی کا سلگتا ہوا سایہ تم پر اسی طرح پڑتا رہا تو؟ —— کیا ہوگا ہ——

لمحے گذرتے رہے دور اُفق پر آوارہ بادلوں کے منتشر ٹکڑے منڈلاتے رہے اور وہ جاہل لڑکی کے اندوہناک انجام پر غور کرتا رہا۔ پھر احساس نے اپنا زاویہ تبدیل کر لیا۔

سامنے کوارٹروں کی تاریک قطار —— اُس کے ذہن میں پڑوسیوں کے چہرے اُبھرنے لگے، جمن بھشتی کی جوان لڑکی روشن —— مدراسی خاندان کے سیاہ فام بے ہنگم بچے — مفلوک الحال ٹیلر ماسٹر — دلّی کی بھاری بھرکم لڑاکا عورت —— یہ سارے لوگ اس قطار میں آباد تھے — مختصر سی متعفن گلی کے یہ وہ روتے بسورتے کردار تھے جو کوارٹروں کے تاریک کمروں سے اُبھرتی ہوئی وحشتِ بے کرانہ کی اذیت ناک سولی پر چڑھے ہوئے جی رہے تھے۔ مدراسی خاندان کے سیاہ فام بے ہنگم بچے دن بھر گلی میں شور مچایا کرتے تھے گندی نالیوں اور غلاظت کے انباروں پر کھیلنا ان کا محبوب مشغلہ تھا — غلیظ گڑھوں کے متعفن پانی

بن نہانے والی نئی پود جو پروان چڑھ کر خود گندگی کے تالاب کی گھناونی موج بننے والی تھی ۔

یہ اُس کے ذہن کی کرب آمیز اُپج تھی، کاش وہ اُن کی ماؤں سے پوچھ سکتا کہ اس بے معنی تخلیق سے اُن کا مدعا کیا تھا ؟ ــــ عورت کا پیٹ ــــ گندے گڑھوں اور غلیظ نالیوں میں کھیلنے والے قابلِ نفرت بچوں کو جنم دے کر بھی کیا عورت کا پیٹ کہلا یا جا سکتا ہے ؟ ــــ وہ ان کالے کلوٹے بچوں کی مدقوق ماؤں سے دریافت کر سکتا ــــ یہ کلبلاتے ہوتے کیڑے ــــ گندے گڑھوں اور غلیظ ماحول کے شہزادوں کو جنم دیتے ہوتے انھیں شرم کیوں نہ آئی تھی ! ــــ

اور پھر دوسرا چہرہ ــــ ایک خاکہ ــــ انسانی کردار کی دُھندلی پرچھائیں ــــ مدراسی خاندان کے بے ہنگم بچے اس کے حافظے سے محو ہو گئے ــــ اُس کی جگہ جمن بھشتن کی جوان لڑکی روشن نے لی تھی تیکھے نقوش اور سلونی رنگت والی روشن عمر ۲۲ سال سکنہ سعود آباد ولمبر مہاجر کالونی جو دن بھر دروازے میں بیٹھی بیڑیاں بنایا کرتی ہے، جس کے چہرے پر پڑا ہوا لمبا سا گھونگھٹ اسے دیکھکر اوپر اُٹھ جایا کرتا تھا۔ جمن بھشتن کی جوان لڑکی کے تیکھے نقوش بھی اسے پسند نہیں تھے ــــ سلونی رنگت پر فاقوں کی زردی بہت جلد نمایاں ہو جاتی ہے ۔ ایسی ہی زردی اُس کے سلونے چہرے پر بھی چھائے رہتی ــــ لیکن نہ معلوم بیڑیاں بنانے والی تین بہنے کی چھوکری اسے دیکھکر بے اختیار مسکرا

کیوں دیتی ہے۔ اور مسکراتے ہوئے اُس کے چہرے کے نقوش اجنتا کے آرٹ کی طرح پُراسرار ہو جایا کرتے تھے۔ اور ایک دن جب وہ کہیں جا رہا تھا، گلی سنسان تھی تو روشن نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے اُسے سلام بھی کیا تھا ——— پاکستانی عورت جب محبت کرتی ہے تو وہ پہلے مرد کو سلام کرتی ہے، گویا یہ سلام محبت کا سگنل ہوتا ہے ——
اور وہ سگنل کئی بار ہو چکا تھا۔ اور سرے والے کوارٹر کا ٹیلر ماسٹر تو سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اپنا فیتا قینچی اور استری لے کر نکل جاتا تھا اور شام کو واپسی پر وہ جاپانی چائے کے باغ کا رینگتا ہوا حقیر سا کیڑا دکھائی دیتا تھا ——— یہ سب لوگ اب سو رہے تھے دن بھر کے مصائب روزگار سے اپنا دامن چھڑا کر بے کواڑ کے کوارٹروں میں بے ہوش پڑے تھے —— مدراسی خاندان کے بے ہنگم بچے بھی ——
ٹیلر ماسٹر بھی اور جمعو بھشتن کی بیٹی روشن بھی ———

سو جاؤ! ——— سو جاؤ ——— اُس کا ذہن چیخا ——— لیکن نیند کوسوں دُور تھی۔

روشن اپنی ماں کے ساتھ سو رہی ہو گی وہ کل صبح پھر ہڑیاں بنائے گی اور اسی طرح پاس کے کوارٹر والی معصوم رشیدہ بھی اپنے کم سن زرد رو کبھائی کے گلے میں باہیں ڈالے کنواری نیند کے رومانی جزیروں میں ہو گی۔ اور اس کا بڑا بھائی کرم خوردہ بنیان پہنے شہر کی طویل سڑکوں پہ رکشا گھسیٹ رہا ہو گا۔ رکشہ کے پہیے ٹانگوں کی جنبشوں سے ہم آہنگ

ہو کر بے نام فاصلے طے کر رہے ہوں گے۔ بازوؤں کی سخت گرفت لوہے کی گرم سلاخوں کی طرح سائیکل کا ہینڈل سنبھالے ہو گی اور ان کی بے خواب آنکھوں کے گرد نیم سوختہ تمناؤں کا دھواں منڈلا رہا ہوگا۔ یہ سب کچھ وہ بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

رشیدہ کا جوان بھائی ——— رکشہ کے پہیے ——— بے نام فاصلے ——— نیم سوختہ تمناؤں کا دھواں ——— بولٹن مارکیٹ ——— صدر بندر روڈ ——— لسبیلہ ہاؤس ——— آدمیوں کے ہجوم، ایک آنہ سواری ——— چار آنے سواری ——— آٹھ آنے سواری ——— فلمی گیت ——— دو گز کفن کا کپڑا۔ اے مرے دل کہیں اور چل ———

رشیدہ کا بھائی ہر روز اسے ٹرام گودی کے پاس ملتا تھا، اصرار سے چائے پلاتا، بس کا کرایہ دیتا اور پھر کہتا

اسلم بھائی۔ رات کا کھانا رشیدہ سے لے لینا

وہ خاموش رہتا

کوئی بات نہیں۔ انسان انسان کے کام آتا ہے

خاموشی اور گہری ہو جاتی

فکر مت کرو! ملازمت مل ہی جائے گی ——— وہ جانے کے لئے کھڑا ہو جاتا ——— اچھا اسلم بھائی دھندے کا ٹائم ہے، سالی کوئی اچھی سی سواری مل جائے تو مزا ہے۔ رشیدہ سے کہہ دینا رات میرا انتظار نہ کرے اور اسلم بھائی۔ رشیدہ ——— الفاظ زبان پر آنے سے پہلے ہی دم

توڑ دیتے ـــ وہ غمگین انداز میں مسکراتا۔ کھنکارتا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ملباری کے ہوٹل سے نکل جاتا۔ رکشا بے کراں ہجوم کی وسعت میں کھو جاتی۔ اور وہ خود پھیلی ہوئی دھوپ کے پس منظر میں ان گنت تاریکیوں کے سمندروں کا جوار بھاٹا دیکھتا رہ جاتا۔

یہ رات کسی درد کا شجر ضرور ہے۔

یہ موسم کی تراشی ہوئی بے کیف تہمت ہے۔

ایک آہٹ کے بعد

سرگوشی ـــ آواز ـــ قدموں کی اُبھرتی پھیلتی اور محیط ہوتی ہوئی چاپ جو عالمِ احساس کی کئی منزلیں طے کرتی ہوئی اس تک آئی تھی۔

وہ چارپائی سے اُٹھ بیٹھا ـــ کون ہے؟ ـــ

میں ہوں رشیدہ ـــ کمرے کے کھڑکی نما روشن دان سے اُس کا دُھندلا دھندلا چہرہ نیند کی گرہوں کے ساگر میں ڈوبا ہوا کنول دکھلائی دے رہا تھا ـــ

آجاؤ ـــ

نہیں نہیں آپ آجائیے ـــ میں اندر نہیں آسکتی ـــ پھر ایک قلیل سے توقف کے بعد وہ بولی ـــ میری آنکھ لگ گئی تھی ـــ آپ بھوکے ہوں گے ـــ کھانا لے لیجیے ـــ

اس کے خمیر میں کوئی عنصر جیسے کم سا ہو گیا تھا۔

رشیدہ ـــ رشیدہ سنو تو! ـــ روز روز کی مہمان داری

کب تک چلتی رہے گی اُس نے آہستہ سے جملہ پورا کیا ـــ میں نکما ہو گیا ہوں ـــ حالات نے مجھے بے کار وجود بنا دیا ہے ۔ واپس لے جاؤ یہ روٹی ـــ میں ان انگاروں کو نہیں نگل سکتا ۔ سنتی ہو رشیدہ، بہت بہت شکریہ ۔ اب تم واپس جاؤ ـــ

وہ جھپاک سے اندر آ گئی ـــ اُس کی پلکیں بھیگ چکی تھیں ـــ

وہ جلدی جلدی بولی ۔ میں آپ سے کچھ اور نہیں چاہتی ـــ

ہچکیاں ـــ آنسو ـــ تاریک کمرہ ـــ تنہائی ـــ رشیدہ کا وجود ـــ وہ گھبرا گیا ـــ

آئندہ کھانا کبھی واپس نہ کرنا یہ میری التجا ہے ۔ حکم ہے ، اُس نے کھانے کے برتن چارپائی پر رکھ دیئے ۔ پھر اُس کا آنچل لہرایا ـــ اور وہ باہر بھاگ گئی ـــ

رشیدہ کی التجا ، رشیدہ کا حکم ، بھیگی پلکیں ، لرزتے ہونٹ ـــ اُس کو اپنا دل پارہ پارہ ہوتا ہوا معلوم ہوا ـــ اگر انسان کا نفس آئینے کی طرح ہوتا تو آج کی رات وہ یقینی ان تمام پھیلی ہوئی کرچوں کو جمع کر کے ان پر زندگی کے المیے کی اندوہناک داستانوں کو تحریر کر دیتا ۔

دوسرے دن صبح دس بجے — ٹیلیفون کی گھنٹی بجی

کرنل تصار باجزید — کرنل تصار بایزید کہاں ہیں؟

میں بول رہا ہوں — خاتون آپ یقین کریں میں کرنل ہوں۔

اوہ! ٹیلیفون پر اس قسم کی غلط فہمی ہو سکتی ہے — مخالف سمت سے آواز آئی۔ غلطی کی تلافی میں ہمارا تعارف ہو جائے تو اچھا ہے۔

میرا نام "ریلا مارکونی" ہے۔ گھر — گھر — کی آواز بھی ساتھ ہی سنائی دی — میں ایک امریکن فرم میں ملازم ہوں۔

بہت خوب — کرنل کے لہجہ میں ملاقات کا اشتیاق تھا۔

آپ رابرٹ ٹیل کو جانتے ہیں — رابرٹ ٹیل سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی خولصورت سی عورت — جس کی ہنسی بہت ہی دلفریب

ہے ---

ہاں ہاں! وہ ایک مہربان دوست کی حیثیت سے مجھے سرفراز فرما چکی ہیں - میرا مطلب ہے وہ .....

رٹیلا مارکوئی نے کرنل کو فقرہ پورا نہیں کرنے دیا۔

اُن کا ایک مختصر سا پیغام ہے - وہ آج کی رات آپ کی دعوت پر کیفے ڈی پیرس نہیں آسکیں گی - آپ کو افسردہ نہ ہونا چاہیئے - معزز کرنل --- ان کا جانا بہت ضروری تھا - فرائض کی بجا آوری انھیں کراچی سے دور لے جا چکی ہے - ہزار ہزار معافیاں --- اس نیک دل خاتون کی طرف سے --- آواز سے بولنے والی کے دلی تاسف کا اظہار ہو رہا تھا --- کرنل تصار یابڈ ید --- امریکن بہت مصروف زندگی گذارتے ہیں - آپ دیکھیئے نا رابرٹ ٹیل کی مثال، خیر کوئی بات نہیں، یہ کمی تو پوری ہو سکتی ہے - شکریہ --- میرا فون نمبر ۸۰۲۷ ہے - آپ سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہو گی - کرنل نے مختصراً کہا

ابھی ہماری ملاقات کہاں ہوئی ہے یہ تو رسمی باتیں ہیں۔

اس منزل کو بھی سر ہو جانا چاہیے - آج رات آٹھ بجے --- زیبح لکژری میں کیا آپ سے نیاز حاصل ہو سکے گا؟ چاکلیٹی رنگ کا سوٹ میرے جسم پر ہو گا --- میرے خدو خال کچھ کچھ مشرقی ہیں - میرا مطلب ہے آپ مجھے آسانی سے شناخت کرلیں - اچھا تو پھر چند گھنٹوں کے لئے خدا حافظ!

آواز سنائی دی - الوداع

اُس نے ریسیور ہاتھ سے رکھ دیا ___ رابرٹ ٹیلی چلی گئی ___ نہ معلوم کہاں پیغام بھی کچھ نامکمل سا تھا۔ لیکن اچھا ہوا ___ آج تعارف کی ایک نئی منزل سَر ہو گئی ___ احساس و خیالات کی اجنبیت ٹکرا کر ہم آہنگی کے سانچوں میں ڈھلے گی اور کسی نہ کسی موڑ پہ ایک اجنبی دل دھڑک اُٹھے گا ______

رات کافی طویل ہوتی ہے۔

دفعتاً اسلم کی آنکھ کھل گئی — کواڑوں کی آڑی ترچھی دراڑوں پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ قافلۂ شب کبھی کا گذر چکا تھا — ہنگامے جاگ اُٹھے تھے۔ اور باہر گلی میں وہی مانوس سا شور بلند تھا —

بہت دیر سوتے — یہ رشیدہ کے بھائی کی آواز تھی — جو نہ معلوم کب سے بیٹھا ہوا اسلم کے بیدار ہونے کا انتظار دیکھ رہا تھا۔

کیا رات دیر میں سوئے تھے —؟

اُس نے طویل جماہی لے کر چارپائی چھوڑ دی۔

تم کب آئے؟

بہت سویرے — اور تمھارے لئے ایک تحفہ بھی لایا ہوں۔

تحفہ؟ وہ کچھ متحیر سا ہو گیا

ہاں ایک پاگل انسان ـــ جو مجھے روزانہ بولٹن مارکیٹ کے قریب ملتا تھا ۔ کل اُس نے مجھ سے کہا میں تمھارے گھر چلوں گا ۔ میں نے اُس سے گھر چلنے کا سبب دریافت کیا

بس مجھے گھر لے چلو ۔ پاگل بہ ضد تھا ۔ پورے بارہ سال سے میں نے کسی گھر میں دو پل کبھی نہیں گذارے ہیں ۔ مجھے روٹی کھائے بھی عرصہ ہو چکا ہے ۔ چائے بسکٹ ۔ گلے سڑے پھل ۔ اور اسی قسم کی دوسری چیزوں پر بسر ہو رہی ہے ـــــــ مجھے اپنے گھر لے چلو گے نا ؟ ـــ وہ برابر ضد کر رہا تھا ۔ میں سب کے ساتھ بیٹھ کر مسکرانا چاہتا ہوں ـــ رونا چاہتا ہوں ـــ پھر وہ دیوانگی پر اُتر آیا تھا کہنے لگا ۔ تم نہیں جانتے میرے ہاتھوں میں قہر کا کوڑا ہے ۔ میری آواز میں رعد کی گرج ہے ۔ میری سانسوں میں بجلی کی چمک اور طوفانوں کا شور ہے ـــ میں مجسم تباہی ہوں ـــ مہیب تباہی ـــ انسانوں کا دشمن وہ مجھے لگاتار رہا ـــ میں تمھارے گھر جاؤں گا ۔ آخر آج میں اُسے اپنے ہمراہ لے آیا ۔ رشیدہ کا بھائی ایک سانس میں سب کچھ بتا گیا ـــ

چلو اٹھو ! ناشتہ کب کا تیار ہے ۔

اُس نے انکار میں سر ہلایا ۔

ایسا نہیں ہو سکتا اسلم بھائی !

رشیدہ کے بھائی کا اصرار بڑھتا گیا

اُس کے ذہن میں ایک مبہم غیر واضح سی یاد اُبھری ـــ یہ

میری التجا ہے ۔ حکم ہے ۔ ضد ہے آئندہ کبھی انکار نہ کرنا۔ ڈھلتی رات رشیدہ کی نم آلود پلکیں، تنہائی ۔۔ انکار کی شمشیریں کند ہو تی گئیں ۔ جذبات کا مشترک رشتہ بھوک بن کر رشیدہ کے بھائی کے ساتھ اُس کے کواٹر میں داخل ہو گیا ۔۔۔ بوڑھا پاگل سر جھکائے صحن میں بیٹھا تھا ۔۔۔ رشیدہ کا چھوٹا بھائی اسکول جا چکا تھا اور رشیدہ کشتی میں ناشتہ لیے دونوں کی منتظر تھی ۔

آپ کی تعریف ؟ وہ مسکراتے ہوئے پاگل سے مخاطب ہوا۔

گاڈ ۔۔۔ پرمیشور ۔۔۔ خدا ۔۔۔ میرے متعدد نام ہیں ۔۔۔ پاگل بڑی بے نیازی سے بولا۔

رشیدہ نیچی نظروں سے مسکرا رہی تھی ۔۔۔ اب اُسے بھی پاگل سے دلچسپی پیدا ہو چکی تھی ۔

میں گاڈ ہوں ۔ خدا ہوں ۔ ایشور ہوں ، میرا کوئی آغاز نہیں ہے میری کوئی انتہا نہیں ہے ۔ میرے کہے پر تمھیں یقین نہ آئے گا ۔۔۔ نادان بچو ! میرے کام دیکھو ۔ ربوبیت کے سمندر کی گہرائی محسوس کرو۔ میرے ہاتھوں میں غضب کا کوڑا ہے ۔ میں دنیا کے انسانوں سے سمجھ لوں گا ۔ آخر وہ میرا کر ہی کیا سکتے ہیں ۔۔ ؟

دونوں نے گاڈ صاحب کو ناشتہ پر مدعو کیا ۔۔۔ رشیدہ نے آگے میں سے کشتی بڑھا دی ۔ لیکن اُس کے بھائی نے آہٹ آواز دے لی۔ اسلم بھائی سے کیا پردہ ۔۔ ؟ آج سب ساتھ ناشتہ کریں گے ۔

گاڈ صاحب! آج کل آپ کا شغل کیا ہے؟ — وہ چائے پیتے ہوئے کہنے لگا۔ آپ بڑے مصروف نظر آتے ہیں۔

"گاڈ کیا کرتا ہے؟" عالموں کی نگہداشت — ویسے آج کل میں نئی بائبل لکھ رہا ہوں۔

رشیدہ کی مسکراہٹ کا افسوں جوانی کا رنگ بن کر اس کے ہونٹوں پر چھلک پڑا — اور اس کا بھائی نہ معلوم کیوں سنجیدہ ہو گیا۔ ممکن ہے وہ اسے گاڈ ہی سمجھ رہا ہو یا گاڈ کا قریبی عزیز —

آپ کا مکان کہاں ہے؟

گاڈ کا کوئی مکان نہیں ہوتا۔ نئی بائبل کی تصنیف مکان میں بیٹھ کر نہیں ہو سکتی —

رشیدہ کے بھائی نے ہنستے ہنستے لبوں سے اس کی مزید تواضع کی۔

گاڈ تم بے بہت خوش ہے۔ میں نئی بائبل میں لکھوں گا روح القدس کی آواز کو پہچاننے والے کلامِ ربانی کے گل پوش ساحل تک آ گئے تھے۔

کیا بائبل تصنیف کی جا چکی ہے — اس نے پاگل سے پھر مذاق کیا۔

سلسلہ جاری ہے — سلسلہ جاری رہے گا۔ کائنات کے آخر لمحے تک

چائے ختم ہو گئی تو رشیدہ خالی برتن اٹھا کر کوارٹر کے تاریک کچن میں چلی گئی۔

آپ آرام کریں — غالباً وہ اب چلا جانا چاہتا تھا۔

نہیں نہیں تم یہاں بیٹھو گے — پاگل گرجا — عرصہ ہوا دنیا والے

گاڈ کا سکون چھین چکے ہیں۔ اُس نے ان سب کو خلوص سے دیکھتے ہوئے کہا میرے بچو! شیطانی طاقتوں نے مجتمع ہو کر انسانوں کا روپ دھار لیا۔ انسان نے شیطان کی پشت پناہی سیکھ لی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے گاڈ کی دنیا جہنم بن گئی ۔۔۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔ وہ بولا ۔۔ اکیلا گاڈ کر بھی کیا سکتا تھا۔ بستی بستی، شہر شہر خون کے دریا بہہ۔ لپکتے ہوئے شعلے آسمان تک گئے، برہنہ عورتوں کے جلوس نکلے ۔۔۔ چھاتیاں کٹیں۔ شرم گاہوں کو چھیدا گیا۔ شیطان کا اشارا پاکر انسان نہ جانے کیا ہو گیا۔ میں فرشتوں کو پکارتا رہا۔ ادھ جلی لاشوں کے انبار پر روتا رہا۔ مگر گاڈ کی بات کسی نے نہیں سُنی۔ اس کے بعد میں نے پرانی بائبل، گیتا، وید، سب کو منسوخ کر دیا ۔۔۔ اب میں نئی بائبل لکھ رہا ہوں۔ جو صرف بنی اسرائیل تک نہ ہو گی۔ وہ برابر بولتا گیا۔ اب میں موجودہ دور کے انسانوں کا دشمن ہو گیا ہوں۔ میرے پاس قہر و غضب کا کوڑا ہے۔ یہ میرا کچھ نہیں کر سکیں گے۔ وہ کڑکتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ امریکہ دور مار میزائل بنا رہا ہے۔ روس ایٹم بم تیار کر رہا ہے۔ برطانیہ ایشیا اور افریقہ میں نئے جال پھیلانے میں مصروف ہے۔ ہر ملک عالمگیر جنگ کے دہانے پر ہے۔ یہ میرا انتقام ہے۔ وقت کی آگ بدکار انسانوں کو بھسم کر دے گی۔ گوشت و پوست دھجیاں بن کر اڑ جائیں گے۔ ہڈیوں کے انبار کو دیے آنکھیں گے۔

رشیدہ کا بھائی بڑی توجہ سے پاگل کی باتیں سُن رہا تھا۔ اس

انہماک میں عقیدت بھی تھی اور لاشعوری خوف بھی۔

سنتے ہو بچو! پھر ان نیم سوختہ ہڈیاں سے میں ایک نئے آدم کی تعمیر کروں گا۔ تخلیق نئے مراحل طے کرے گی۔ خدا تخلیق کے تاریخی موڑ سے گذر سکتا ہے۔ اسی لئے تو میں پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں یہ نیا آدم دل کا تخت ہزارہ کبھی برباد نہیں کرے گا۔ ہیر جدائی کی آگ میں جل کر اب کبھی بھسم نہ ہو گی۔ صاحباں کے بھائی مرزا کا سینہ تیروں سے چھلنی نہیں کر سکیں گے۔ نئی بائبل میں ان باتوں کی ممانعت ہو گی ——

وہ خاموش ہو گیا —— اُس کے چہرے پہ اُداسی چھا گئی۔

رشیدہ نہ جانے کس ضرورت سے لجاتی ہوئی کمرے میں آئی واپس چلی گئی —— رنگ و بو کا لمحاتی دائرہ بنا اور ٹوٹ گیا۔

پاکستانی قومیت۔ ہندوستانی نسل۔ انگریزی خون —— امریکن قوم —— نیگرو۔ حبشی، اچھوت، عیسائی صدیوں کی تفریقی خلیج، نفرت کے پہاڑ۔ خون کی لکیریں۔ میں ان سب کو ختم کر دوں گا۔ نیا آدم سسٹم وجود کے تمام قلعوں کو ڈھا دے گا۔ گاڈ کے عظیم تعمیراتی منصوبے کی تکمیل کا انتظار کرو۔ پھر وہ اسلم سے مخاطب ہوا۔

جانتے ہو! انسانی زندگی کی طرح قوموں کے بھی یہی مدارج بنتے ہیں۔ پیدائش، جنس، موت ——

ٹھیک ہے۔ اب وہ دلچسپی سے پاگل کی باتیں سُن رہا تھا۔

ہیں تینوں مدارج پر آج کے مجرم انسانوں کو شکست دینے کا

فیصلہ کر چکا ہوں۔

"نئی بائبل کی تصنیف اور نئے انسان کی تخلیق یہ آپ کا ایک عظیم کارنامہ ہوگا۔" اسلم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ گاڈ نہیں تو پہنچے ہوئے ولی ضرور ہیں۔" رشیدہ کے بھائی نے اسلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"اے روح القدس! پہاڑ تیری تعظیم اور چاند سورج تیرا طواف کریں گے۔ اب تجھے کوئی مغلوب نہیں کر سکے گا۔" پاگل قدرے توقف کے بعد بولا۔ "تم لوگ جا سکتے ہو۔ پاگل اسی گھر میں رہے گا۔"

اور جب وہ رشیدہ کے بھائی کے کوارٹر سے باہر نکل رہا تھا تو جمن بھشتن کی لڑکی روشن دروازے میں مٹی ڈھیریاں بنا چکی تھی۔ اور جب اُس سے اُس کی نظریں چار ہوئیں تو چہرے کے سلونے نقوش اجنتا کے آرٹ کی طرح پُراسرار ہو گئے۔ اور وہ متبسم انداز میں اسے گھورتی رہی۔

آٹھ بجنے سے دس منٹ پیشتر کرنل قصار بایزید گہرے چاکلیٹی رنگ کے سوٹ میں ہوٹل کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اسکوائر کے مختصر پارک میں مختلف ممالک کے آدمی بیٹھے تھے۔۔ ولیس ولیس کے لوگ، عورتیں، بہت ہی کم تعداد میں بچے۔ اسکوائر کی کیاریوں میں سفید گلاب کے پھول کھلے تھے۔ اور "بیچ لگژری" کے دروازے کے عین سامنے بجلی کا بڑا قمقمہ روشن تھا۔۔۔ آٹھ بج کر پورے پانچ منٹ پر ایک نوجوان خاتون کا سایہ اُس کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔

آنے والی نوجوان خاتون نے سر سے پیر تک اُس کا جائزہ لیا، مسکرائی اور مترنم انداز میں کہنے لگی۔

"کرنل قصار بایزید؟"

"ہاں خاتون! کرنل قصار بایزید!" — وہ تعظیماً جھک گیا

"اٹیلا مارکونی" اُس کی مترنم آواز سُنائی دی — آپ سے مل کر مجھے بے پایاں خوشی ہوئی ہے — وہ پیشانی پر بکھری ہوئی لٹ کو درست کرنے لگی — عزت افزائی کا شکریہ — ترک مغرب کے انسانوں سے کہیں زیادہ فراخ دل ہوتے ہیں۔

اٹیلا مارکونی اُس کے سامنے تھی۔ اٹیلا کے بال سنہری تھے۔ رنگ بہت زیادہ سفید تھا، ہونٹ دل کش اور حسین تھے۔ لیکن نچلے ہونٹ کا اُبھار اوپر کے ہونٹ کے اُبھار سے کہیں زیادہ تھا۔ آنکھیں مشرقی عورت کی طرح تھیں۔ اور عمر کا اندازہ وہ نہیں کر سکا۔ عورت کی عمر کا صحیح اندازہ کرنا ویسے بھی مشکل ہوتا ہے۔

"مجھے خوشی ہے آپ با مذاق خاتون ہیں" کرنل نے بے تکلفی کے ساتھ کہا۔ نیچ لگثری کا بار بہت دل کش ہے۔ یہاں کے جام اوکلینڈ کے بنے ہوئے ہیں۔ پیرس کی شراب بھی دستیاب ہو جاتی ہے۔"

وہ دونوں ایک ساتھ مڑے اور سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اٹیلا نے کرنل کا بازو تھام لیا۔

"میں اٹلی کے شہر روم سے آئی ہوں" وہ شوخی سے بولی

مقدس روشنیوں کا شہر گرجاؤں کا شہر، تقدیس اثر گنوار سے باپ پوپ کا تاریخی شہر۔ حبشہ، مسولینی، جنگِ عظیم۔ تباہی، تاریک دائرہ اُبھرا اور کرنل کے ذہن کی گہرائی میں ڈوب گیا۔

"آپ کا خادم احمد نواز ———— پھر اُس نے قریب کی میز کی طرف اشارا کیا جو خالی ہو چکی تھی۔

"آپ کا خادم احمد نواز دہلوی ہر خدمت بجا لائے گا۔"

وہ دونوں کرسیاں کھینچ کر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ گئے۔

کرنل کے ہونٹوں پر تبسم پھیلا ہوا تھا۔

خادم احمد نواز دہلوی! تم یہاں کب سے ہو؟

"تقسیم کے بعد سے سرکار۔"

کیا وطن یاد آتا ہے؟

ہر دن اپنے ساتھ نئے تقاضے اور نئے رشتے لے کر آتا ہے۔ میں ہی نہیں میری طرح ہر دہلوی ماضی کو بھول چکا ہے۔

اٹیلا مارکوئی دہلوی بارمین کا جواب سُن کر خوش ہو گئی۔

لال قلعہ — چاندنی چوک — اور جامع مسجد، کرنل احمد نواز دہلوی سے باتیں کرنے میں دلی لگاؤ محسوس کر رہا تھا۔

دیکھے ہوئے خواب کسے یاد رہتے ہیں؟

اٹیلا کی آنکھوں میں دلچسپی کی مزید چمک پیدا ہو گئی۔

دہلوی بارمین پوچھ رہا تھا — آپ کیا پینا پسند کریں گے؟ —— سرخ شراب؟

ہاں —!

سرخ شراب بہتر چیز ہوتی ہے — وہ گردن ہلا کر چلا گیا۔

مشرق کے لوگ ذہین ہوتے ہیں۔

دانشمندی کی بات کرنا مشرقی لوگوں کا حصہ ہے۔ کرنل نے فخریہ کہا۔ معاف کرنا ان کے پاس ایٹم بم، میزائل، اور مہلک ہتھیار نہیں ہیں۔ صرف ذہین اور دلچسپ باتیں ہیں۔

اس طنز کا شکریہ ـــ اٹیلا مارکونی مسکراتی رہی۔

سرخ شراب کی بوتل اور گلاس دہلوی بارمین کے ہاتھ میں یوں معلوم ہو رہے تھے جیسے لال قلعہ کا کوئی مینار اور حنائی فصیلوں کے کنگورے بیچ لگژری کے بار میں رقص کرنے آگئے ہیں۔

بارمین نے تمام چیزیں میز پر رکھ دیں۔ کرنل نے دونوں گلاس لبریز کیے۔ احمد نواز درمیان سے ہٹ گیا۔

رات کی خوش گوار ساعتوں کی سلامتی کا پہلا جام" کرنل نے لبریز گلاس اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"اجنبی ترک کی محبت و خلوص کا جام اطالیہ کی اٹیلا مارکونی کی جانب سے۔"

سرخ شراب کے گلاس ٹکرا کر خالی ہو گئے۔ بار میں کچھ کچھ آدمی بکھرے تھے۔

رابرٹ ٹیل کے اس طرح جانے کا افسوس تو ہو گا؟ اٹیلا کی آواز میں نادیدہ طنز کی ملائمت تھی۔

کوئی خاص نہیں

وہ میری سہیلی ہے - میں اسے پسند کرتی ہوں - کاش وہ اپنی عمر کے معاملے میں جھوٹ نہ بولتی -

انیلا نے دوسرا گلاس لبریز کیا - کرنل نے اُسے ترکی برانڈ کا سگریٹ پیش کیا -

نبیل مجھے سب کچھ بتا چکی ہے فراخ دلی، بلند حوصلگی، آپ کے سفر کا مقصد -

کرنل نے اُس کی بات سُنی ان سُنی کر دی - آپ کے سنہری بال کس قدر خوبصورت ہیں -

بے شک - چہرے کی زوال آمادہ رونق ان سے قائم رہتی ہے - اٹیلا نے تمسخر کے لہجہ میں کہا - معاً وہ سنجیدگی سے بولی -

"کیا میری بات پسند آئی -؟"

"بہت زیادہ"

"اٹیلا مارکونی!"

"کرنل قصار!"

"آپ کہاں کہاں گئی تھیں ؟"

"اٹلی میرا وطن ہے اور پاکستان میری روزی کی پناہ گاہ "

"بس!"

"جی بس! لیکن پاکستان کے کئی شہر گھوم چکی ہوں"

"آپ نے یہاں کیا دیکھا؟ عظیم تر عمارتیں، مغل شہنشاہوں کے

مقبرے۔ شالا مار، تاریخی بارہ دری، شاہی قلعہ، جواب شکستہ ہو کر عظمتِ رفتہ کی لاش کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔

"ان میں سے ایک بھی نہیں"۔ اٹیلا نے دوسرا گلاس بھی ختم کردیا۔ موہن جوڈارو، ٹیکسیلا، انارکلی کی قبر"۔ اٹیلا نے کونی سگریٹ کا کش لے کر بولی تاریخ کی متعفن لاش کا طواف کرنا مجھے پسند نہیں — میں ماضی اور حال کی کڑیاں ملانا حماقت سمجھتی ہوں۔ جو دام گذر چکے ہیں جو زمانہ دور جا چکا ہے ان کو دھندلے نقوش حال کے آئینہ خانہ میں دیکھنا ایک پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟

عجیب نظریہ ہے۔ کرنل مسلسل سگریٹ پی رہا تھا۔

نظریہ۔ عجیب ہی ہوا کرتا ہے کرنل قصار — غالبًا وہ بحث کے موڈ میں تھی۔

تاریخ کا طواف کرنے کے بجائے میں نے آج کی زندگی کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اس ملک کی دلکش صبحوں اور سلونی شاموں کے دامن میں بکھرے ہوئے سینکڑوں افسانوں کو پڑھا ہے۔

یہ اچھی خاصی شاعری ہے۔

میں شاعری کو خبط سمجھتی ہوں — جذبات جب ناآسودہ رہتے ہیں تو شعور اپنے نکاس کا ذریعہ شاعری کی بحروں کو سمجھنے لگتا ہے۔ آپ خود سوچیے۔ اگر محبت اتنے ہی اہتمام سے کی جاتی تو میرا خیال ہے زندگی کی وسیع تاریخ میں بے شمار عاشق پیدا نہ ہوتے۔

بحث کا رخ موڑنے کے لئے کرنل نے بات بدل دی۔

• بار میں بیٹھکر تاریخ اور شعر کے ٹھوس فلسفہ پر بحث ایک عجیب سی بات تھی۔

آپ پاکستان کی دلکش صبحوں اور سلونی شاموں کی افسانہ طرازیوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ کرنل کی آواز میں رومانیت پیدا ہو چلی تھی۔ اور سامنے والی میز پر بیٹھے ہوئے دو ایرانی آقائے آقائے کہہ کہہ کر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔

میں پانچ دریاؤں کے دیس پنجاب بھی ہو آئی ہوں۔ جہاں ہیر پیدا ہوئی تھی۔ سوہنی نے گیت گائے تھے۔ جہاں کی چاندنی راتیں اطالیہ کی نورانی راتوں سے مشابہ ہوتی ہیں۔

بہت خوب:

ان چاندنی راتوں میں بستی کی ان کنواریوں کا میں نے رقص بھی دیکھا ہے جن کی جوانیاں زمین کے سینے سے پھوٹتی ہوئی رنگین نو نظر آتی ہیں۔

اٹیلا نے یکایک اخلاق و شائستگی کا مظاہرہ شروع کر دیا

ترک فطرتی حسن کا زیادہ طالب ہوتا ہے۔ مغرب کے لوگ نیچرل بیوٹی سے محروم ہیں۔ تو میں کہہ رہی تھی نا ڈھولک کی تھاپ پر دیہاتی نغموں کی کیف باریاں شراب کے اس لبریز گلاس سے بھی زیادہ روح پرور ہوتی ہیں۔

پانچ دریاؤں کا دیس - پنجاب - کرنل آہستہ سے بولا

اٹیلا نے تائیداً فقرہ دُہرایا

پنجاب - جہاں سرسوں کے کھیت ہیں دیہات کی الھڑ لڑکی اپنے محبوب کا انتظار دیکھتی ہے - ماہیا گاتی ہے اور کچے مکھن کی گولیوں سے اس کی تواضع کرتی ہے - میں اس زندہ تاریخ کے طواف میں مصروف رہی ہوں -

وہ خاموش ہو گئی - سرخ شراب کی بوتل نصف کے قریب ختم ہو چکی تھی - پیچ لگژری کے بار کی ساری میزیں آدمیوں سے پُر تھیں - دونوں ایرانی آقا کے آقا سے کیکرا بنے کسی ہراور کا ذکر کر رہے تھے ... ور باہر سڑکوں پہ روشن جلوے ظلمتوں کا سینہ چیرتے ہر قدم پر ہزاروں طوروں کو جنم دے رہے تھے - اور بار مین دھنسی ہوئی آنکھوں والا دہلوی بار مین تیزی سے اِدھر اُدھر آجا رہا تھا

تھوڑے وقفے کے لئے ایک مبہم خموشی اُن کی زبانوں پر چھا گئی - اٹیلا مارکونی کی خموشی ، آخر بیکھم کے سانچوں میں ڈھل گئی -

ہائے

ایک بات دریافت کر سکتا ہوں ؛ - کرنل لجاجت سے بولا

مہربان ترک - ایک - نہیں - نسو -

آپ نے بھی کسی سے محبت کی ہے ؟ - حادثتاً ، اتفاقاً یا کسی اور طرح ؟

اٹیلا کے مسکرانے کا انداز پہلے سے بھی زیادہ دل کش ہو گیا -

کبھی نہیں

پوچھ سکتا ہوں کیوں ؟

بڑا مشکل سوال ہے ——— پیارے کرنل !

میں معافی کا خواستگار ہوں ———

ڈارلنگ ! وہ بڑی بے تکلفی سے کہنے لگی ۔۔ روایتی انداز میں معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کرو ——

کرنل نے سگریٹ کا آخری کش لیا ۔ وہسکی منگائی جائے ؟

وہ ترنگ میں تھی ۔ ابھی شراب میرے اعصاب پر ہتھوڑے نہیں برسا رہی ۔۔

احمد نواز بارمین اپنی مخصوص چال کے ساتھ پھر ان کے درمیان آ گیا ۔ ایک مرتبہ پھر پہلے کی طرح آرڈر دیا گیا ۔ اور وہ سر کو خم دے کر تیزی سے ہجوم میں غائب ہو گیا ۔ تھوڑی دیر بعد دہلوی بارمین واپس آ چکا تھا ۔

" اور کوئی حکم ؟ " اُس نے خالص مشرقی آداب کا مظاہرہ کیا ۔

تم جا سکتے ہو

پھر احمد نواز بارمین کا فرشی سلام اُس کے چہرے کی محکومانہ مسکراہٹ بیچ لگژری کے بار روم میں آدمیوں کے ہجوم نے اُسے اپنی طرف بُلا لیا ۔

" اگر تم باتیں نہ کرو گے تو میں چیخنے لگوں گی "

کرنل بے ساختہ ہنس دیا ۔ پھر تم اور حسین معلوم ہو گی ۔

اٹیلا کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی ۔۔ تم نے مجھ سے محبت کے بارے میں پوچھا تھا نا؟

"تم نے نفی میں جواب دیا تھا"

"کسی حد تک غلط بھی اور صحیح بھی"

اٹیلا مارکونی ایک خوبصورت معمہ دکھائی دے رہی تھی ناقابلِ حل معمہ! جو بہت مشکل تھا۔

"اب سے چار سال قبل ۔ وہ ایک گہرا سانس بھر کر بولی ۔۔ میرا حافظ اب سے چار سال پہلے کے اوراق الٹ رہا ہے ۔ وہ مجھے روم کے ایک گرجا میں ملا تھا ۔ پولینڈ کا خوش رو مغنی ۔ میں ہر اتوار گرجا جایا کرتی تھی ۔ تسکین قلب حاصل کرنے ۔ وہ کہتی رہی ۔ جونی کی عمر اس وقت تیس سال کی ہو گی ۔ خوش رو، اچھی شکل کا یہ مغنی، گرجا آیا کرتا ۔ مقدس صلیب کو چومنے کے لئے نہیں ۔ بس ویسے ہی ۔ اکثر وہ گرجا کے بہار آسا پارک میں بیٹھ جایا کرتا تھا ۔ جہاں چمکتی ہوئی دھوپ پھیلی ہوتی ۔ غالباً نئے نغمے کی دھن میں یا ان کنواریوں کو دیکھنے کے لئے جو طلائی صلیبیں، اٹھائے ادھر ادھر گھوما کرتی تھیں۔

مجھے سگریٹ تو دو کرنل ۔۔ اٹیلا تھکی ہوئی نظر آنے لگی۔

کرنل نے اسے سگریٹ پیش کیا ۔ اور ایک ننھا سا شعلہ سگریٹ کے سرے پر رقص کرنے لگا۔

"کیا ٹیلر کو بلایا جائے؟"

"تم بات سنو! احساس کے ویرانے میں مجھے مجروح چھوڑ دینا ظلم ہوگا۔ اُس نے بڑی بے چارگی سے کہا۔ یہ میری زندگی کی سب سے زیادہ پُراسرار کہانی ہے۔ یہ "جونی" کا قصہ ہے۔ پھر جیسے کائنات کے سارے ساز بج اُٹھے۔ اور اُن کی جھنکار آسے مایوسی کے سمندروں میں لے ڈوبی۔

اٹیلا مارکونی نے سگریٹ کا کش لیا۔ "وہ پہردں بیٹھا مریم کی کنواریوں کو گھورا کرتا تھا۔ گرجا کا معمر راہب بھی جونی کی اس حرکت کو تاڑ چکا تھا۔ وہ کسی موزوں موقعہ کی تلاش میں تھا تاکہ اس پر خفگی کا اظہار کر سکے۔ اور پاک خدا کا موردِ عتاب ٹھیرا سکے۔

بار کا ماحول خوبصورت ہے۔

زندگی اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ اٹیلا مارکونی نے اپنے منتشر بالوں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

پھر اُنھوں نے وسکی کا ایک ایک گلاس ختم کیا۔

"میرے لئے یہ بڑی مسرت کا باعث ہے کہ کوئی مجھ سے میرے بارے میں پوچھ رہا ہے۔

اٹیلا غالباً حافظے میں موزوں الفاظ کا ذخیرہ جمع کر رہی تھی ــــ "پولینڈ کا مغنی، ہاں تو ایک دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، سمندری ہوا کی سرکشی، فضا میں تلاطم پیدا کئے تھی۔ لیکن اتوار کو گرجا جانا ضروری تھا۔ میرے ذہن میں پولینڈ کے البیلے مغنی کا خوبصورت چہرہ

ناچ رہا تھا۔ نغمات کا خالق، کیا میں اس سے تعارف حاصل کر دں ؟
میں سوچتی رہی۔ میں خود سے کہتی رہی۔ ایسی بھی کیا ضرورت ہے۔ دل و دماغ کا یہ جواب کس قدر ناکافی اور غیر تسلی بخش تھا۔ البیلا مغنی سحر کار طاقت کا مالک، آخر اس میں حرج ہی کیا ہے میں اس طوفانی صبح کا آغاز ایک اجیالے تعارف سے کروں۔ تھوڑی دیر بعد میں گرجا جانے کے لئے تیار ہو چکی تھی۔

پولینڈ کا مغنی! ۔ مقدس چرچ، طوفانی صبح، ابر آلود آسمان، نغمے، ناتمام نغمے، پُراسرار شخصیت۔ ایک راز، ایک گتھی، ایک عقیدہ ——
نہ معلوم وہ وہاں کیوں آتا ہے۔ اُسے کسی سے محبت ہو گی۔ کسی نن سے۔ مریم کی کنواری بیٹی سے۔ یا پھر وہ آوارہ ہو گا۔ آزاد منش فاقہ زدہ فن کار جس کی ہر تخلیق حالات کے تاریک اسٹیج پر دم توڑ چکی ہو گی۔

موٹر کا ہارن زور سے بجا۔ حادثہ، ایکسیڈنٹ۔ — روم کی ایک کشادہ سڑک۔ مگر میں بچ گئی۔

ڈرائیور نے پریشانی سے کہا۔ بی بی کسی شاہراہ پر چلتے ہوئے انسان کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس پر چلنے والے اور بھی ہیں۔ اچھا شکریہ!۔
کار آگے نکل گئی۔ فراٹے بھرتی ہوئی۔

میں اپنی جگہ شرمندہ تھی۔ پولینڈ کا جوان مغنی میرے ذہن کے افق پر نغمے بکھیر رہا تھا۔ اب میں اپنے پاگل پن پر ہنستی ہوں۔
چرچ کی پرشکوہ عمارت آ گئی۔

نماز عبادت ختم ہو چکی تھی — بائبل پڑھنے کی آواز اور مقدس گھنٹیوں کا فسوں ٹوٹ چکا تھا۔ چرچ کی بلند عمارت پاک خدا کے کنوارے بیٹے کے غم میں بوڑھے آسمان سے باتیں کرتی نظر آ رہی تھی۔ وہ حسبِ معمول پارک میں بنچ پر بیٹھا ہوا خلاؤں میں نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔

میں اس کے پاس پہنچ کر ٹھٹکی — بات کس طرح کی جائے؟ — چرچ کا مینار مجھے گھور رہا تھا۔

ہے بی آؤ!" وہ مجھے اپنے قریب دیکھ کر بولا — "تم ہر اتوار کو گرجا آتی ہو نا؟"

میں اس کے پہلو میں بیٹھ گئی — ترشے ہوئے بالوں کا گچھا اس کی پیشانی پر پڑا ہوا تھا۔ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔

تمھارا نام کیا ہے بے بی؟ مجھے تو جونی کہتے ہیں؟"

میں نے اسے اپنا نام بتایا

"تم میرے پاس آتے ہوئے جھجک رہی تھیں۔ ہر اجنبی مرد سے بات کرتے ہوئے تمھاری عمر کی عورتیں اسی طرح جھجکتی ہیں۔"

میں نہ جانے کس طرح بولی۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔

میں جانتا تھا بے بی! وہ نرم آواز میں بول رہا تھا — ایک دن تم ضرور میرے پاس آؤ گی — جونی کے پاس — پولینڈ کے نامور لیکن فی الحال گمنام مغنّی کے پاس۔

بیچ لگژری کا بار ابھی تک آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ دہلوی بار میں

بڑی دیر سے نہ معلوم کہاں تھا۔ اور ایرانی بدستور بحث میں مصروف تھے ۔۔ آقائے اسفندیار! بجا است برادرم! کرنل کے ہونٹوں پر ہنسی پھیل گئی۔

"ہاں! آقائے اٹیلا مارکونی پھر؟"

"ہم ایک دوسرے سے ملتے رہے ۔ ریسٹورانوں میں، باغوں میں، سمندروں کے پُرشور کناروں پر۔ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا ۔۔۔۔ ملاقاتیں روز روز کی تفریحیں ۔ سیریں!"

"ہوں!" کرنل نے گلاس ہونٹوں کے قریب کر لیا۔

"پھر ایک دن لجاتے ہوئے میں نے اُس سے کہا۔ جونی! تم مجھ سے شادی کر لونا"۔

"شادی؟" پرشور نغمے کی طرح اس کی آواز فضا میں بکھر گئی۔ آسمانی دعاؤں کے سہارے ازدواجی زندگی کا آغاز ۔۔۔ وہ پریشان سا ہو گیا ۔ جیسے میں نے کوئی روح فرسا بات کہدی تھی ۔۔۔ لیکن وہ بہت جلد سنبھل گیا ۔ اُس کا چہرہ پہلے کی طرح معصوم ہو گیا ۔ جیسے یہ لمحاتی تغیر اُس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ میری اپنی نظر کے فریب تھے۔

"بے بی!" جونی میرے شانوں کو تھپ تھپاتے ہوئے بولا ۔۔۔ "شادی تو حبس کی موت ہے ۔"

"مگر یہ ہماری گناہ آلود زندگی؟ فحاشی، راتوں کی نیم عُریانی؟" میری آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے ۔

وہ بڑے زور سے ہنسا' بے بی اگر جوان عورت کے جسم کا کیف آور لمس ، دو دلوں کا ایک ساتھ دھڑکنا فحاشی کے زمرے میں آتا ہے تو زندگی خود فحش ہے - ایک ارذل ترین فحش گالی ' اور اس سے کہیں زیادہ جنس کی وہ ترکیب ... جو ہمارے عالمِ وجود میں آنے کا سبب بنتی ہے !

میں کچھ نہیں سمجھی جونی کیا کہہ رہا تھا

سمندر کے کنارے میں اُس کے بازوؤں میں محصور ہو گئی - ایک تلخ تجربہ کے بعد بھی مجھے افق پر طلوع ہوتا ہوا چاند اچھا معلوم ہو رہا تھا - جونی کی جوان باہوں کا لمس -

"بے بی ! شادی کے کچھ معاشی محرکات ہوتے ہیں - جنسی ضروریات سے کہیں زیادہ اس میں روایت کا دخل ہوتا ہے - وہ روایت جو ہمارے آباؤ اجداد سے ناقابلِ شکست اصول بنی ہوئی ہم تک چلی آرہی ہے "

وہ ٹھیک تو کہہ رہا ہے - مجھے اپنے سارے جسم میں بجلیاں دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں -

شادی کے کچھ محرکات ہوتے ہیں ' سماج کے پیٹ سے پیدا ہونے والے اُلجھے ہوئے معاشی محرکات - جو آزاد جسموں کے لمس پر پابندیاں عائد کر کے ہمارے آباؤ اجداد کی روایتیں بن کر اب ہم تک آئے ہیں ---

اُس نے بازوؤں کی گرفت اور سخت کر دی۔

میں اب کچھ سمجھنا نہ چاہتی تھی ۔ جونی کیا کہہ رہا ہے ۔ وہ اکثر ایسی قسم کی باتیں کیا کرتا تھا ۔ بہکی بہکی ۔ الجھی الجھی ۔ قدیم یونان کے کسی بوڑھے فلسفی کی طرح اور فلسفے سے میں ہمیشہ بھاگتی رہی ہوں ۔۔ مگر ۔۔ ہاں ! جونی اتنے دنوں کی رفاقت کے بعد میرے بہت قریب ہو گیا تھا ۔

اور پھر اُسی رات

سمندر کا پر شور کنارا، اُچھلتی ۔ ابھرتی، پھسلتی موجیں، دور درختوں کے جھنڈ سے اُبھرتا ہوا چاند، کسی آبی جانور کے بولنے کی غیر مانوس آواز جونی مجھ پر جُھک گیا ۔

"تم سمجھ گئی ہو نا بے بی ؟ میں زندگی کی آخیر ساعتوں تک تم سے وابستہ رہنا چاہتا ہوں ۔ لیکن تمھیں شادی کے پنجرے میں قید کر کے اپنا محکوم بنانا نہیں چاہتا ۔ جنس کے تقاضے ازدواجی زندگی کی چکی میں بہت جلد پس جاتے ہیں ۔۔ زندگی کا سفر بہت دراز ہے ۔ ہم ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہیں گے ۔۔ لیکن کسی بھی موڑ پر بغیر کسی تردد کے جُدا بھی ہو سکتے ہیں ۔ ہمارے اس فیصلے کی مخالفت میں نہ تو سماج ہو گا اور نہ پاک خدا کی آسمانی شریعت !"

وہ آج صبح سے شادی کے مسئلے پر باتیں کر رہا تھا ۔ نہ معلوم اُس کے ذہن میں کیا تھا ۔ ایک نوجوان گلوکار کے ذہن میں ۔۔ شبنم یا آگ پھول یا شرارے ؛ پاک خدا بہتر جان سکتا ہے ۔

اُس نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"تم تو جانتی ہو میری جیب میں ایک لیرا تک نہیں ہے۔ میں ایک وقت کی روٹی بھی نہیں کھا سکتا۔ اگر تم نہ ہوتیں تو۔۔؟"

چاند پر سیاہ بادل چھا گیا۔ آبی پرندے کی آواز آنا بند ہو گئی۔ اور ایک پُرشور موج ساحل سے ٹکرا کر لوٹ گئی ـــــ جونی ہولے ہولے کہہ رہا تھا۔

"تم نہ ہوتیں تو میں فاقوں کی آگ میں جل چکا ہوتا۔ میرا وجود میری ہڈیاں حالات کے ڈھلوانوں پر چکنا چور ہو چکی ہوتیں۔ اور میں روم کی سڑکوں پر گھسٹتا ہوا بھیک مانگتا ہوا نظر آتا۔"

میں حیران تھی ـــ تم تو مغنی ہو! ان گنت گیتوں کے خالق!

"میرے نغمے، میرے گیت ابھی عام کہاں ہوئے ہیں؟ آواز کے سوداگر نئے گلوکار کی قیمت لگاتے ہوئے ڈرتے ہیں"۔ اُس کا لہجہ تلخ تھا۔

ابھی نصف رات باقی تھی

جونی نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ ہو سکتا ہے میرے نغمے ذہن میں گھٹ کر مر جائیں۔ مجھے زندگی میں شہرت و مقبولیت کا کوئی موقعہ نہ ملے۔ یہاں تک کہ میں اور میرا فن ذلیل ہو جائیں۔ اور میں یہ محسوس کرنے لگوں کہ خدا یا شیطان جو بھی ہیں ہیں۔ مگر میں کب کا مر چکا ہوں! ـــــ

وہ خاموش ہو گیا۔ اُس کے بشرے سے ایک ایسا کرب عیاں تھا جو کم و بیش تمام نااُمید انسانوں کے چہروں سے جھلکتا ہے۔ جونی کے بشرے سے بھی ایک ایسا ہی کرب عیاں تھا۔ ناکامیاں جن کا مقدر ہوا کرتی ہیں۔

"کیا تمھیں جونی کا کردار پسند نہیں؟" اٹیلا نے کرنل سے دریافت کیا کرنل کی آنکھوں میں نمی تھی۔ "میری قوتِ فیصلہ ابھی سو رہی ہے۔"

"اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟"۔ اٹیلا کے ہونٹوں پر افسردہ مسکراہٹ کا سورج طلوع ہوا۔

کرنل بدستور پی رہا تھا۔ پہلے مجھے ساری داستان سناؤ!

وہ انکسار، خلوص، اور گھلاوٹ کے لہجہ میں کہنے لگی

جونی خاموش تھا۔ میں بھی خاموش تھی۔ سمندر کا پُر شور کنارا بھی خاموش تھا۔

تبے بی!" وہ بڑی دیر بعد بولا۔"ایک بے وطن قلاش مغنّی کو تم نے نوازا۔ میں شکرگزار ہوں۔ لیکن تم سوچو تو ہماری دائمی قربت کا تصور ایک قیمت مانگتا ہے۔"

میں سمندر کی ریت پر ہاتھ سے لکیریں بناتی رہی۔

"یہ جو سماج ہے! اس میں باعظمت زندگی گنتی کے چند افراد ہی گذار سکتے ہیں۔ تم تو خود ذہین ہو۔ بغیر شادی کیے تو ہمیں کچھ مسرتیں مل بھی گئیں۔ لیکن شادی کے بعد تو ہمیں سکون کا ایک سانس

کبھی نہ ملتا۔۔ اور تم بکھرا نہیں رہا ہوں پر چل نکلتیں جو بعد میں تمھارے لیے انتہائی تکلیف دہ ثابت ہوتیں۔

سمندر کی ریت پر بنائی ہوئی لکیروں کو میں نے مٹا دیا۔

"مجھے ایسی باتیں کرتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ مگر۔ سچ اٹھائے بغیر عظمت بھی تو حاصل نہیں ہو سکتی۔"

"تم مجھے فریب تو نہیں دے رہے ہو جونی؟"

جونی نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔ پھر ایک کرب انگیز تبسم اُس کے لبوں پر پھیل گیا۔ اس تبسم میں کوئی خاص دل کشی نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ روح کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہوا درد و کرب کا عمیق طوفان تھا ——

"امکانی طور پر میں تم سے سچ بولتا رہا ہوں۔"

میں سمندر کی ٹھنڈی اور خواب آور ریت پر لیٹ گئی —— ماحول الف لیلیٰ کی داستانوں کا عنوان معلوم ہو رہا تھا۔ اور ساحل سمندر سے شہر کے اسی چرچ کی عمارت کا ایک بلند حصہ نظر آ رہا تھا جس کے پارک میں جونی پہلے پہل مجھ سے ملا تھا۔۔

وہ اٹک اٹک کر بولا — میں چاہتا ہوں، میری یہی کوشش رہی ہے کہ —— کاش! میرے پاس چند ہزار لیرا ہوتے — جس سے درائی شو منعقد ہو سکتا۔ میرے گیت سستی نیلامی سے بچ جاتے۔"

کبھی نہ پوری ہونے والی آرزوؤں کا اظہار بھی کتنا مشکل ہوتا

ہے۔۔ تیز و تند سمندری ہواؤں کی طرح ان کا وجود بھی خطرناک ہوتا ہے۔۔ ایک نہیں کئی طوفانوں کا پیش خیمہ۔ میرے ذہن نے کروٹ لی۔۔ روشنی کی موج نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔۔ روح کی گہرائیوں سے شفقت کے عظیم سوتے پھوٹنے لگے۔ میں نے محسوس کیا میں بدل سی گئی ہوں، بدلتی جا رہی ہوں، میرا وجود وہ نہیں رہا ہے جواب سے پہلے تھا۔ جونی میری ہمدردیوں کے سہارے بہتر مستقبل کو پا سکتا تھا پھر میری آنکھیں بھیگ سی گئیں۔

پولینڈ کا غریب مغنی! ایک گلوکار، کیا عورت کا ذہن جب کسی انقلاب سے دوچار ہوتا ہے تو اس کی پلکوں پر آنسوؤں کے دیئے جل اُٹھتے ہیں۔۔؟ میں یہ کس سے پوچھتی۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ فیصلہ جو میں کر سکتی تھی۔

سمندر کی ٹھنڈی ہوا نے جونی کو سُلا دیا تھا، چاند بادلوں کی اوٹ میں تھا اور کسی نامعلوم ملک سے آتا ہوا جہاز سطحِ آب پر روشنیاں بکھیر رہا تھا۔ میں اُٹھی اور جونی کے سینے پر سر رکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں سننے لگی۔

اُس کی پیشانی پر بکھرے ہوتے سنہری بال میں نے اپنی انگلیوں سے سنوار دیئے۔۔ جونی ہمیشہ خوش رہو! میرے دل میں تمہارے لئے ہمدردی ہے۔ اور جب میں نے جُھک کر اُسے پیار کیا تو وہ کچی نیند سے بیدار ہو گیا۔

اس نے مجھے بازوؤں کی گرفت میں لینا چاہا۔

"نہیں اب نہیں جونی! میں پیچھے ہٹ گئی ۔۔ میں تمھیں کامیاب دیکھنا چاہتی ہوں ۔ تمھیں بہت بڑا آدمی بننا ہے ۔ ایک معروف مغنی"!

دفعتہً ایک بے رحم رکاوٹ ایک جھجک ہم دونوں کے درمیان حائل ہو گئی ۔ جونی کی ساری ذکاوت جاتی رہی ۔۔ غم سے دھندلائی ہوئی پیشانی پر خفت کا پرتو نمایاں ہو گیا ۔

میں نے اس کی طرف لکی اسٹار کا پیکٹ بڑھا دیا ۔۔ لو یہ سگریٹ تو پیو ۔۔۔۔

جونی نے خاموشی سے سگریٹ لے لیا ۔

ہماری زندگی کی بنیاد غم پر ہے ۔۔ تم نے کبھی سوچا ہے؟

جونی نے لاپروائی سے کہا ۔ مشرقی انسانوں کی طرح میں کبھی نہیں سوچ سکتا ۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں ۔ تمدن کی ان کالی شاہراہوں پر جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں ۔ ہم باعزت سفر جاری نہیں رکھ سکتے ۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو جونی! ۔ خدا تم پر رحم کرے ۔ اور چرچ کی ان کنواریوں پر بھی، تمھارے نغموں پر بھی ۔

جونی حیران ہو گیا ۔ چرچ کی کنواریاں؟

"چرچ کی مقدس کنواریاں جو بافراغت روٹی کھا کر دنیا میں کسی جونی کے کام نہیں آسکیں"۔

وہ بے ساختہ ہنس دیا۔ مشرق کے سفر پہ جانے والے جہاز نے رخصتی سیٹی کے بعد اپنا لنگر اُٹھا دیا۔

میں نے اُس سے کہا ۔ میں تمہیں اپنی تمام عمر کا پس انداختہ دے دوں گی ۔

"بھلا وہ کس لئے ؟" جونی انجان بن رہا تھا۔

۔ تاکہ تم ! ورائیٹی شو میں اپنے کمال کا مظاہرہ کر سکو۔

۔شٹ اپ ۔ اُس نے خوش طبعی کے ساتھ کہا

ہماری بعض باتوں کو سنجیدہ ہونا چاہیے ۔ پولینڈ کے منعتی تمھیں اب کسی چیز سے زیادہ دلچسپی نہیں لینا چاہیئے ۔ اور — اور —

اُس نے مجھے فقرہ پورا نہیں کرنے دیا۔

"میں تم میں انوکھی دلچسپی لے رہا ہوں"

"یہ تمھاری غلطی ہے ۔ اب فلرٹ کرنے د زمانہ گذر چکا ہے — ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں ہیں"

آج کی رات کچھ عجیب رات تھی ۔ میرے دل میں جونی کے لئے جو ہمدردی کے جذبات تھے ان کی نوعیت کو میں خود سمجھنے سے قاصر تھی۔

فضا میں ہماری سرگوشیاں کھیلتی رہیں ۔ جونی بچوں کی طرح مچل مچل کر انکار کرتا رہا ۔ میں اسے سمجھاتی رہی ۔ غصہ ۔ تلخی ۔ نرمی ۔ محبت اور آخر ایک مرحلہ پر جونی نے میرے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گیئں۔

"بے بی! میں محسوس کر رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں۔ ایک دوست کو ہاتھ بڑھا کر دلدل سے کھینچنے کا شکریہ کس طرح ادا کیا جا سکے گا؟ تا عمر۔ زندگی کی آخیر ساعتوں تک۔"

اُس کی آواز میں درد گھلا ہوا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ نا آشنا۔ جبیں تم میرے متعلق کچھ نہیں جانتی تھیں لیکن تجربہ سے معلوم ہوا یہ احساس تخیل کا تھا۔ نہیں نہیں شکریہ! بہت بہت شکریہ! — میرا فن، میرے گیت سب تمھارے ہیں —

پھر وہ میرے شانوں پر سر رکھکر بچوں کی طرح رونے لگا۔ اور دور کوئی آبی پرندہ پھر بول اُٹھا تھا۔ اور چاند بادلوں کی اوٹ میں تھا۔ آنے والے جہاز کی تیز روشنیاں ساحل کی زمین کو جگمگا رہی تھیں۔

اگلی شام کو میں نے اسے اپنے فلیٹ پر مدعو کیا تھا۔ وہ کچھ مضمحل سا صوفے پر نیم دراز تھا۔ معلوم نہیں احترام کی جو دیوار میں نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کی تھی۔ اس کے سائے میں سستانا اس کے لئے نئی سی بات ہو — ایسے ہی تاثرات میرے بھی تھے۔ جیسے میرے سامنے ایک چھوٹا سا جوئی بیٹھا تھا — میری ہمدردیوں کا مستحق، اعانت کا طالب، میں اُس سے اب بھی پیار کر رہی تھی۔ مگر یہ پیار کتنا سادہ تھا۔ ایک دیہاتی لڑکی کے معصوم دل کی طرح! —— پھر اس کے چہرے پر دیکھتے ہی دیکھتے محبت کی ایسی کرن مچلی جس

میں جذبات کے تصنع کی ملاوٹ نہ تھی۔

"میں اپنی گم نامی کی آخر شام تنہا گذارنا نہیں چاہتا۔"

میں نے اس کی بات کا جواب دینے سے گریز کیا۔

"یہ ایک حقیر سی رقم ہے مگر تمھاری ضروریات کی کفالت کر سکے گی۔"
نوٹوں کا بنڈل میں نے اُس کی گود میں ڈال دیا۔ شاید اس وقت دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے۔

اُس نے کسی بے تابی کا اظہار نہیں کیا۔ میں اس کے جواب کی منتظر رہی۔ جونی آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

"کل شام سے مجھے ایک روگ سا لگ گیا ہے۔ جیسے میری روح سلگ رہی ہو۔ مجھے ان نوٹوں سے کہیں زیادہ تمھاری پُرکیف مسکراہٹ چاہیے۔"

میں نے پیار سے اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"پاگل نہ بنو! میں دیکھ رہی ہوں تم بہت بڑے فن کار بنو گے، زندگی میں ایسے مرحلے بھی آتے ہیں جہاں وقتی جذبات کے تقاضوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔"

جونی کی آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے۔ اُس نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں وہ مجھے چند ساعتوں تک دیکھتا رہا۔ پھر بغیر کچھ کہے نوٹوں کا بنڈل اُٹھا کر غمزدہ حال سے کمرے کی سیڑھیاں اُتر گیا۔ میں نے بالکنی سے دیکھا وہ ہجوم کو چیرتا ہوا جا رہا تھا۔ اور جب اُس نے

پنٹ کرفلیٹ کی بالائی منزل کی طرف دیکھا جہاں میں کھڑی تھی تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں ہاری ہوئی بازی جیت چکی ہوں۔ اور اس وقت جو میری آنکھوں میں آنسو ہیں۔ وہ خوشی کے آنسو ہیں۔ اور یہ آنسو اب کبھی خشک نہیں ہوں گے۔ پاک خدا جونی پر رحم کرے۔ اور چرچ کی وہ کنواریاں بھی اسے معاف کریں جو اپنی زندگی میں کسی بھی جونی کے کام نہیں آسکتیں!۔۔۔ پاک خدا ہم سب کو دیکھتا ہے۔

چھ مہینے گذر گئے۔ اس نے مختصر سے وقفہ کے بعد کہنا شروع کیا۔ چھ مہینے کے عرصہ میں جونی ایک دن بھی مجھے نہیں ملا۔ اب وہ پہلے کا گمنام مغنی تو نہیں رہا تھا۔ شہر کے گلی کوچوں میں اس کا تذکرہ تھا اس کے گاتے ہوئے گیت روم میں گھر گھر عام ہو چکے تھے۔ روم کا پریس اسے اپنے وقت کا بے مثل گلوکار تسلیم کر چکا تھا۔ ہر قدم پر اس کے کھیلوں کے پوسٹر دیواروں پر چسپاں نظر آتے تھے۔ چھ ماہ کے اس طویل عرصہ میں جونی کبھی میرے فلیٹ پر نہیں آیا۔ نہ میں نے ہی اس سے ملنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اب بھی میرے لئے وہی تھا۔ ایک الھڑ سا مغنی، خوش رو انسان جس کی کامیابی میری اپنی کامیابی تھی۔ اس سے مجھے کوئی شکایت نہ تھی۔ ملک کے بہت بڑے مغنی کی ہتک تھی کہ وہ روم کی ایک ایسی عورت سے اپنے تعلقات رکھتا جس کی زندگی کی بنیاد گمنامی کی موت پر تھی۔

کرنل نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔" غالباً جونی تمھیں بھول

چکا تھا!۔"

وہ شانت کی تصویر نظر آرہی تھی۔۔ کرنل قصار بایزید۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتی؟ فرض کرلو وہ رابرٹ ٹیل ہی ہوتی جس کے ساتھ تم ایک رات گذار چکے ہو!

معاً دور کسی شرابی نے شفاف فرش پر گلاس پھینک دیا۔ جس سے فضا میں ایک جھن جھناہٹ پھیل گئی!

پاس بیٹھے ہوئے ایرانی نے اپنے ساتھی سے پھر آقائے اسفندی کہکر عمر خیام کی رباعیات پر بحث شروع کردی۔

"میں طربیہ باتوں کو پسند کرتا ہوں" کرنل نے اٹیلا کے رخساروں کو چھوتے ہوئے کہا

"اگر میری جگہ کوئی اور ہوتی تو وہ کب کی پارہ پارہ ہو چکی ہوتی! یقین جانو۔ وہ مجھے اس عرصہ میں شدّت سے یاد آیا۔ یہ بھی تو میرا احساس کمتری تھا۔ یا اس عورت کی ضد جو مشفقانہ روپ دھار کر جوئی پر بے ریا محبت کی بارش کرچکی تھی"۔

"کیا پھر وہ کبھی نہیں آیا؟" کرنل کے لہجے میں تاسف تھا۔

ایک ابر آلود دن جس کی اداس دوپہر آفتاب کی تمازت سے محروم تھی اُس کے قدموں کی مانوس چاپ مجھے سُنائی دی۔ وہی مخصوص سیٹی، وہی ہلکا ہلکا شور اور جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو میں اُس کی طرف پشت پھیر کر کھڑکی سے شہر کا نظارہ دیکھنے لگی۔

"بے بی!" سنتی ہو، میں آیا ہوں۔

میرا دل زور سے دھڑکا۔ لسنائیت کمزوری کے سانچوں میں ڈھل کر اُبھرنے لگی۔ میری آنکھوں کے سامنے دور دور تک اندھیرے پھیل گئے۔ پھر ان اندھیروں میں میں گم ہونے لگی۔ اندھیرے۔ ان گنت اندھیرے۔ جو ناچ رہے تھے۔——— جو ناچتے جا رہے تھے۔

"بے بی! تم ناراض ہو۔؟ میں امریکہ جا رہا ہوں۔ تم نے مجھے خود اعتمادی دی تھی نا؟ اب اسے ٹھوکروں سے چکنا چور نہ کرو۔ میں امریکہ چلا جاؤں گا آج رات دس بجے۔"

میرے دل میں ایک شعلہ سا سُلگ اٹھا۔ جس کی روشنی نرم نرم سی تھی۔

پھر اُس نے کہا۔ "بے بی صرف ایک مرتبہ میری طرف دیکھ لو۔ کیونکہ رحم محبت کی طرح نازک چیز ہے۔"

میں شہر کی سب سے زیادہ آباد شاہراہ کو بے معنی دیکھتی رہی

"تمھیں کبھی مجھ سے محبت نہیں ہوئی"۔ وہ بولا۔ "میں جا رہا ہوں"

میرے دل کا شعلہ بھڑک کر جہنم بن گیا۔ جس کی روشنی سے آنچ آتی ہوئی محسوس ہوئی اور جب یہ آنچ میری آنکھوں نے دیکھی تو وہ آسمان پر چھائے ہوئے ابر کی طرح برسنے لگیں۔ پھر میں نے تڑپ کر اُس کی طرف دیکھا۔ جوں ہی میں مڑی وہ میرے قدموں پر جُھک گیا۔ سنہری بال پیشانی پر بکھر گئے۔ اور میں۔ یک لخت بدل سی گئی۔ مجھ میں پھر وہ

عورت بیدار ہو گئی۔ جو اب سے پہلے ساحلِ سمندر پر لکیریں بنا کر مٹا چکی تھی وہ عورت میرے جذبات کی دشمن تھی۔ میں نے نرمی سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اب میں سنبھلتی جا رہی تھی۔

"بے بی! تم نے مجھے سب کچھ دیدیا ہے۔ شہرت کی زندگی، دولت اور احترامِ حیات کا بنیادی جذبہ۔ مجھے معاف کر دو بے بی!" اُس کی آواز میں درد تھا۔

میرا اگلا روند ھیا گیا

"میرے منغنی! میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ جاؤ اس براعظم سے اُدھر ایک دوسرے براعظم میں۔"

انیلا مارکونی کی آنکھوں میں اس وقت بھی ایک حسین سی نمی تھی۔

اُس نے ایک بہت بڑی رقم مجھے دینا چاہی۔ مگر میں نے اُسے بھی قبول نہیں کیا۔ اُس نے میرا قرضہ واپس کرنا چاہا۔ میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ اور آخر وہ تنگ آکر بولا۔ چلو میرے ساتھ امریکہ چلو۔

"نہیں جونی۔ اب تمھاری راہیں مجھ سے جدا ہیں۔ جذبات میں آکر وہ فیصلہ نہ کرو جو بعد میں ظہنگا ثابت ہو۔"

"کیا معنی؟" جونی نے پوچھا

یہی کہ اب تم سمندر ہو۔ تمھاری ایک ایک موج بلندیاں چھونے کے ملئے ہے۔ اگر شادی کے بارے میں اتنی جلدی تمھارا نظریہ بدل گیا ہے تو تمھیں ایک ایسی باعزت لڑکی تلاش کرنا چاہئے جس کو تم فخریہ

اپنا سکو۔

وہ جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ میں بہت جلد آؤں گا۔ بے بی! میرے بعد تم یقینی بدل جاؤ گی۔

میں خاموش رہی

میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

اور میں تمہیں بھول جانے کی کوشش کروں گی۔

"اتنی سنگین سزا؟"

جونی میری بات یاد رکھنا۔ ہر وہ آوارہ جسم جسے تم راہ میں پڑا پاؤ اُس پر حقارت کی نظر ڈالنے سے پہلے ایک لمحے کے لئے مجھے ضرور یاد کر لیا کرنا۔ بس اسی مرحلہ پر اور وہ بھی ایک لمحے کے لئے۔ جاؤ خدا حافظ

پھر وہ چلا گیا؟ کرنل نے پوچھا

ہاں وہ اسی رات امریکہ چلا گیا۔ میں پارک شائر کی مشہور تجارتی فرم میں ملازم ہو کر پاکستان آگئی۔ نہ معلوم آج کل جونی کہاں ہے۔ اور آوارہ جسموں کے ساتھ اُس کا سلوک کیسا ہے؟

وہ دونوں اٹھکر کھانے کے کمرے میں آ بیٹھے۔ پاکستانی بٹلر نے رات کا کھانا ان کے سامنے لگا دیا۔ ریڈیو پر کوئی طربیہ گیت نشر ہو رہا تھا۔ کرنل نے اُس سے بے تکلف ہونا چاہا۔ جونی اب بھی یاد آتا ہے؟

وہ بڑے عامیانہ انداز میں بولی۔ ہرگز نہیں۔ میری دو زندگیاں تھیں۔ ہر عورت کی دو زندگیاں ہوتی ہیں اور جب ایک زندگی موت سے

ہم کنار ہو جاتی ہے تو دوسری زندگی اُس کے لئے پناہ گاہ ثابت ہوتی ہے
تھوڑے وقفہ کے بعد وہ پھر بولی۔

وہ محبت کی وارداتیں تھیں اور یہ ——— اُس نے اپنا فقرہ پورا نہیں کیا۔ سمندر کا پُرشور کنارہ آبی پرندے کی غیر مانوس آواز اپنے طویل سفر پر روانہ ہوتا ہوا جہاز ریت پر بنائی ہوئی مدھم سی لکیریں اور جوئی سے وابستہ زندگی کے سارے لمحے ایک یاد بن کر حافظہ کی قبریں سو چکے ہیں۔ اور زندہ انسان قبروں کا طواف کرنا کبھی پسند نہیں کرتے۔

وہ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ بٹلر خالی برتن اٹھا کر لے جا چکا تھا۔ کرنل نے کاؤنٹر پر آ کر بل ادا کیا۔ پھر اُن کے قدم کیفے ڈی پیرس کی طرف اُٹھنے لگے۔

باتیں کس قدر دلچسپ تھیں۔ کرنل نے قطعی جھوٹ بولا۔ مگر وہ ایسا کہنے پر مجبور تھا۔

رابرٹ ٹیل حیدرآباد گئی ہوئی تھی اور وہ تنہا رات گذارنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ تھوڑے دنوں بعد اُسے چلا جانا تھا یورپ یا اناطولیہ کی ان پہاڑیوں کی طرف جہاں اندھیری خندقوں میں پیٹ کے بل رینگنے والے سپاہی اپنے ان دیکھے دشمن کے انتظار میں دور افق پر نظریں گاڑے ہوئے تھے۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ سفر خاموشی سے طے ہو رہا تھا۔ کرنل سگریٹ کے پے بہ پے کش لے رہا تھا۔

وہ دونوں خاموشی سے کیفے ڈی پیرس کی عمارت میں داخل ہو گئے

کیفے ڈی پیرس کا شان دار کمرہ جہاں کرنل کا قیام تھا — وہی آزمائی ہوئی جنسی آسودگی کی نمایاں لکیریں —— وہی ایک عورت کا جوان جسم، وہی اعضاء کا تناؤ — ہونٹوں کا لمس اور گرم گرم طویل سانسیں — مہکتی ہوئی سانسیں۔ کرنل نے کمرے میں داخل ہو کر اٹیلا کی کمر کے گرد اپنے بازو حمائل کر دیئے۔

"سچ بتانا ٹیل کیسی لڑکی تھی ؟" اٹیلا نے خود کو اُس کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔

"تم سے قدرے کم اچھی —— وہ پی کر بالکل مدہوش ہو جاتی ہے۔ آج کی رات —— کی طرح اٹیلا کی آواز میں بھی لرزش آ چلی تھی —

اور اس کا جواب ایک طویل پیار تھا۔ جس میں خود اٹیلا مارکونی کی سازش بھی تھی ——

سحر ہونے تک

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالب

جھینگروں کے ساز بے خاموش تھے۔ کواٹروں کی آڑی ترچھی دیواروں پر بلند ہوتے ہوئے سورج کی دھوپ پھیل چکی تھی ——— اس طرح ایک اداس صبح کا آغاز ہوا۔

رشیدہ کے کواٹر میں پاگل باوقار انداز میں بڑبڑا رہا تھا — میں گاڈ ہوں — خدا ہوں، سارے زمانے کی نیکی ہوں — روشنیاں مجھ سے پیدا ہوتی ہیں —

مدراسی عورت کے سیاہ فام بچے باہر اچھل کود رہے تھے۔ مدقوق ٹیلر ماسٹر اپنا فیتہ اور قینچی لے کر منہ اندھیرے دکان جا چکا تھا۔ اور رشیدہ کا بھائی ناشتے کے بعد پھر اپنی روزی کے جہنم میں جلنے کے لئے روانہ ہو چکا تھا — وہی پُرشور بازار، بل کھاتی ہوئی کشادہ سڑکیں، غیر ضروری آوازیں،

سرمایہ و محنت کی آویزش — کرب، ہیجان — رشیدہ کے بھائی کی پھولی ہوئی سانسیں — صدر، صدر ایک آنہ سواری۔

اُس نے بے دلی سے سگریٹ جلایا اور ناول کا آخری باب پورا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ اپنے کوارٹر میں بیٹھا ہوا آج ناول کا آخری باب پورا کر رہا تھا۔ عام بازاری ناول۔ سنسنی خیز پلاٹ۔ محیر العقل کردار — ناکامیاں، ہجر و فراق، چچا زاد بہن سے عشق، ماموں مرحوم کی وسیع جائداد لڑائی، پستول، فائرنگ، رقیب کی موت، عدالت کا کمرہ، اور پھر ہیرو ہیروئن کا غیر ضروری ملاپ۔ فن کو کون پوچھتا ہے، زندگی کے عکاس ادب کی ضرورت، ملک کے کسی ناشر کو نہ تھی — اور جب ایک ادب دوست ناشر نے اُس سے کہا کہ اسلم صاحب ہمارے فن کار جبھی پیسہ کما سکتے ہیں۔ جب وہ اپنی گذشتہ روایات کو بھول جائیں۔ اور اُس نے انتہائی حیرت سے پوچھا تھا۔

قبلہ! آپ کا مطلب؟—

ناشر نے لاپروائی سے کہا تھا۔ یہی کہ ہمارے گرد و پیش جو بے شمار مسائل بکھرے ہوتے ہیں ایک ذہین فن کار کو انھیں قطعاً نہ چھونا چاہیے۔

"وہ متحیر تھا —— پھر؟"

عوام تفریح چاہتے ہیں —— پبلشر کثیر منافع چاہتا ہے اور مصنف روپیہ۔ یہ اپنے مقصد میں اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب وہ سنسنی خیز گھٹیا پن کو اپنے فن کا شعار بنا لیں۔

پبلشر نے اسے صحیح مشورہ دیا تھا۔ اب وہ کبھی فن کی بلندیوں پر پرواز نہیں کرے گا۔ ان مسائل کی طرف توجہ نہیں دے گا جو اس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں پھر اس نے ایک ایسے ناول کا آغاز کر دیا جس میں وہ سب کچھ تھا جو ناشر نے بتایا تھا۔۔۔ اور آج وہ بہر قیمت اسے ختم کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"اس کا قلم ایک قلیل وقفے کے لئے رکا۔۔۔ پاگل بڑے زور سے چلا رہا تھا۔"

خدا انسان کی سازشوں سے کبھی نہیں ڈر سکتا۔۔۔ بلندیاں گودیتی ہوئی پستیوں کو کبھی سلام نہیں کریں گی۔۔ اسلم کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔۔۔ اس نے سوچا۔۔۔ بے چارہ پاگل۔۔۔

جمعو بھشتن کی جوان لڑکی روشن دروازے میں ٹاٹ بچھائے بیڑیاں بنانے میں مصروف ہو چکی تھی اور جب ایک مرتبہ وہ کسی ضرورت سے باہر نکلا تو روشن نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کا انگ انگ فریاد کر رہا ہے تیکھے نقوش رو رہے ہیں۔۔۔ اس کے ہاتھ بیڑیاں بناتے رہے لیکن وہ اسے اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ ہٹ نہ گیا۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد

سامنے والی قطار کے سرے والے کوارٹر میں رہنے والے ٹیلر ماسٹر کے یہاں پنجاب سے مہمان آگئے۔ دو عورتیں ایک مرد اور پورے سات چھوٹے بڑے بچے!۔۔۔ عورتیں غلیظ برقعے اوڑھے تھیں بچوں کے گلوں میں کپڑوں میں منڈھے ہوئے تعویذ پڑے تھے۔ اور عورتوں کے ساتھ آنے والا مرد

صورت سے ریوڑی فروش دکھائی دے رہا تھا۔

ایک۔ دو۔ تین بڑے۔ اور سات بچے۔

ماسٹر مہمانوں کی آمد کی اطلاع پاکر دکان سے آگیا تھا لیکن اس کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ فیتہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا تھا۔ اور پھر دکھاوے کے لیے اس نے بچوں کو پیار کرنا شروع کر دیا۔ عورتیں غلیظ برقعہ لہراتی اور ریوڑی فروش مرد اندر چلے گئے۔ ساری گلی میں شور مچ گیا۔ روشن نے چلا کر اپنی ماں سے کہا۔ بیچارے ماسٹر کے ہاں مہمان آئے ہیں۔ پورے سات بچے ہیں۔ ۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ وہی ٹیلر ماسٹر اس کے کواڑ میں آگیا وہ خارش زدہ کتے کی طرح سر جھکائے بیٹھ گیا۔ ۔ ماسٹر اسے اچھا ایسا ہی دکھائی دے رہا تھا جیسے خارش زدہ کتا۔ جس کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ جاتی ہے اور وہ سر جھکائے ہر آنے جانے والے کو یوں دیکھتا ہے۔ جیسے اس کے بعد اس کی بے نور آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گی۔

ماسٹر ممیایا ۔ بابوجی!

کہیے ماسٹر جی! ۔

مہمان آگئے ہیں۔ گھر میں ایک پیسہ نہیں ہے۔ اگر؟

وہ سہم سا گیا بیچارے ٹیلر ماسٹر کی "اگر" کا مطلب یہی تو تھا کچھ قرض دیدو۔ ضرورت ہے۔ ۔ لیکن کسی کو کیا معلوم اگر رشیدہ کا بھائی نہ ہوتا تو ۔ ۔ خیر کچھ نہیں ۔ ۔ ماسٹر کے ہاں مہمان آئے ہیں اور مہمان اپنا رزق ساتھ لے کر آتے ہیں ۔ کیا اچھا جو یہ بیچارے اپنا دانہ

پانی ساتھ لانا بھول گئے تھے ۔ خدا بڑا کارساز ہے ۔ قرض لینا بھی تو کارسازی ہے ۔

ماسٹر اُمید دبیم بھری نظروں سے اُسے تک رہا تھا اور اُس کے کواٹر میں سات بچے اور تین بڑے کھانے کے انتظار میں اُس کی بیوی سے بے معنی باتیں کر رہے تھے ۔ کھانا کب تک آئے گا ــــ شاید کبھی نہ آئے ــــــــ ہر مہمان اپنا رزق ساتھ لاتا ہے ۔ مگر آہ یہ بھولے مہمان جو اپنا رزق ساتھ لانا بھول گئے تھے ۔ اور وہ غریب ٹیلر ماسٹر جس کے ہاتھوں سے غیتہ گر چکا تھا ۔

اُس نے ماسٹر سے کہا ۔ آپ بیٹھیں ۔ بس چند منٹ ــــ میں کوشش کرتا ہوں ۔

"پوری کوشش کرنا بابو جی !" ماسٹر کے لہجے میں کرب تھا ۔

اسلم نے باہر نکل کر برابر والے کواٹر کے کھڑکی نما روشن دان میں اپنا سر ڈال کر دیکھا ۔ رشیدہ مختصر سے کمرے میں بیٹھی اپنا فراک سی رہی تھی اور چٹائی کے فرش پر اس کا چھوٹا بھائی کتابیں پھیلائے اسکول کا کام کر رہا تھا ــــ

اُس نے آہستہ سے اُسے پکارا ــــ رشیدہ ! ــــ اور وہ اُس کی آواز سُن کر چونک سی گئی ۔ آج خلاف معمول اسے پکارا گیا تھا ۔

اندر آجائیے نا ! رشیدہ کے گالوں پر شفق پھول رہی تھی ۔

وہ سر جھکائے کواٹر میں داخل ہو گیا ۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کے

دل میں خیال گذرا وہ کیا کہے گی وہ چند روپے کس طرح مانگ سکے گا۔ مگر دوسرے ہی لمحے ٹیلر ماسٹر کی صورت اُس کی نظروں میں پھر گئی۔ جو تین بڑے اور سات چھوٹے مہمانوں میں گھرا ہوا تھا اور جس کے مہمان اپنا رزق اپنے ساتھ لانا بھول گئے تھے۔

رشیدہ بات یہ ہے کہ ــــ اُس کی آواز حلق میں پھنس سی گئی۔

رشیدہ کی متبسم نظروں نے اس کا جائزہ لیا ــــ کہیئے نا بات کیا ہے؟

بات یہ ہے ــــ خیر کچھ نہیں۔

وہ اُس کی گھبراہٹ پر ہنس پڑی ــــ اور پاگل نے غالباً بابل کا نیا صفحہ تصنیف کرتے ہوئے بڑے زور کا نعرہ لگایا۔ محبتوں کے سمندر خشک ہو چکے ہیں۔ مگر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

"کہیئے نا آخر بات کیا ہے؟"

"تمھارے پاس کچھ روپے ہیں؟" ــــ اس کی اپنی ساری ذکاوت کافور تھی۔ "وہ ماسٹر ہے نا!" بے نام جھجک دور ہو گئی ــــ اُسے سب کچھ بتا دینا پڑا۔ بعض لمحے کس قدر تکلیف دہ ہوتے ہیں۔

ہاں ہاں ماسٹر جو ہمارے سامنے والے کوارٹر میں رہتا ہے ــــ

رشیدہ اب تک مسکرا رہی تھی۔

وہی وہی ــــ اُس نے بے حد سنجیدہ ہو کر کہا۔ آج اس کے گھر

میں مہمان آگئے ہیں اور ماسٹر کے گھر کا چولھا ٹھنڈا ہے۔

وہ سب کچھ سمجھ گئی ۔ اسلم نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا "اب تم ہی سوچو! آخر وہ کیا کرتا؟ اب وہ میرے کوارٹر میں بیٹھا ہے ۔ اُسے کچھ روپے چاہئیں۔ کیا ——— تم ——— وہ پھر گھبرا گیا ۔

رشیدہ جھپاک سے باورچی خانے میں چلی گئی ۔ ٹین کے ڈبے کھڑ کنے کی آوازیں آتی رہیں ۔ اور جب وہ واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں پانچ پانچ کے تین نوٹ تھے ۔

میرے پاس بس اتنے ہی تھے ۔ یہ لے لیجئے ——— وہ لجا لجا کر بولی ۔ بھیا آجائیں تو ———

نہیں نہیں ——— اُس نے اس کی بات کاٹ دی ۔ بس یہ کافی ہیں بلکہ دو نوٹ مجھے دیدو ۔ پھر اُس نے پانچ روپے کے دو نوٹ اُٹھا کر جیب میں رکھ لئے ۔ بہت بہت شکریہ ۔ اب میں چلتا ہوں ۔

جاتے ہوئے جب اُس نے مڑ کر رشیدہ کی طرف دیکھا تو اُس کا آنچل سر سے ڈھلک چکا تھا اور وہ ایک معصوم ہنسی ہنس رہی تھی ۔ اور یہ ہنسی اسے آسمان پر پھیلتی ہوئی قوس کی طرح نظر آئی ۔

اپنے کوارٹر کے دروازے پر ماسٹر اُس کا منتظر تھا ۔ اُس نے دونوں نوٹ اُس کے حوالے کر دیئے ۔ ماسٹر کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا

"آپ کا احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا۔"

"ان باتوں کو رہنے دو! مہمان تمھارے منتظر ہوں گے ۔

ماسٹر چلا گیا۔

جب وہ اندر جانے کے لئے مڑا تو معاً اُسے احساس ہوا کہ جیسے روشن بھیگی آنکھوں سے اُسے گھور رہی ہے۔ لیکن آنکھوں کی یہ نمی نہ تو پلکوں تک پھیل سکے گی اور نہ رخساروں پر آنسو بن کر ڈھلک سکے گی۔

"سنتی ہے ماں! روشن نے بیڑی پر تاگا لپیٹتے ہوئے کہا۔ "تو اس بابو کو جانے ہے؟"

جمن بھٹیارن نے آلے کا بڑا سا پیڑا توڑا۔ "کون بابو؟"

یہی کواٹر والا بابو

تجھے کا لینا ہے اس بابو سے؟

تو بات تو سن۔ روشن نئی بیڑی میں زردہ بھرتے ہوئے بولی۔

"کیا یہ بالکل اکیلا ہے؟"

"تو کیوں پوچھ رہی ہے؟"

"معلوم نہیں روٹی کہاں کھاتا ہوگا؟"

لاڈ آرہا ہے تو بلا کر پوچھ لے۔ جمن کے لہجے میں ناگواری جھلک رہی تھی۔۔۔

روشن نے بات ہٹانے کی کوشش کی۔ میرا مطلب تھا پڑوسی پڑوسی کے کام آتا ہے۔ اچھا ہوتا جو بابو کی روٹی بھی تو ڈال دیا کرتی۔

جمن اپنا سینہ پھُلا کر بولی۔ "بس چپ رہ"

ماں کی فہمائش پر روشن خاموش ہو گئی۔ نہ معلوم اُس کے تحت الشعور میں کتنی المناک حسرتیں مچل رہی تھیں۔ وہ بابو کی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ وہ ماں سے کہدینا چاہتی تھی — تیری بیٹی کو روگ لگ گیا ہے۔ تیری بیٹی کا دل دھڑکنے لگا ہے۔ اُس کے پہلو میں ایک ہوک سی اُٹھتی ہے۔ یہ سب کیا ہے ماں — لیکن وہ کچھ بھی تو نہ پوچھ سکی۔ ماں کی تلخ باتیں سُن کر وہ خاموش ہو گئی۔ اور اُس کے سانولے ہاتھ بیڑیاں بنانے میں مصروف ہو گئے۔

بیڑیاں بنتی رہیں۔

اُس کے ذہن میں آپ ہی آپ لکیر سی اُبھری — تفریقی لکیر۔ جو سماج کا دستور بھی کہلائی جا سکتی تھی جس کے ہوتے وہ اپنی ذات برادری کے علاوہ کسی دوسرے کے گھر میں دُلہن بن کر نہیں جا سکتی تھی۔ جو اُسے بتا رہی تھی کہ تو کیا ہے — تیری اوقات کیا ہے — لکیر اُبھرتی رہی۔ تاریکی آہستہ آہستہ اُس کے احساس پر چھا گئی — وہ سوچتی رہی۔ سوچتی رہی ——— یہاں تک کہ دن غروب ہو گیا۔ اور کاغذی کوارٹروں کی شکستہ دیواروں پر شام کے سائے لہرانے لگے۔

بیڑی کا آخری بنڈل بنا کر اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا — جو صحن میں بیٹھی ہوئی پھٹا ہوا کُرتا سی رہی تھی — وہ ہولے سے بولی
"میں ذرا سامنے والے کوارٹر میں ہو آؤں۔"

وہ اپنی ماں کے جواب کا انتظار کیے بغیر رشیدہ کے کوارٹر میں چلی گئی۔

"کیا کر رہی ہو بہن؟" —— روشن نے مسکرانا چاہا۔

"بڑے دنوں میں آئیں" —— رشیدہ کے چہرے پر اب تک خون جھلک رہا تھا۔

"بھیا کہاں ہیں ——؟"

" رشیدہ کی آواز میں لوچ تھا۔ وہ تو رات گئے آتے ہیں۔

"میں نے پادری سے کہہ دیا ہے" پاگل آسمان کی طرف منہ اٹھائے بڑبڑا رہا تھا۔ گاڈ کا حکم کوئی نہیں ٹال سکتا۔ ابدی مسرتوں کے چشمے میں ایک سے چھین کر دوسرے کو دیدیتا ہوں۔ میری مصلحتیں کون جان سکتا ہے۔ اُس کی آواز میں ویرانی تھی۔ شام کے لہراتے ہوئے سایوں میں پاگل کا نحیف وجود ایک متبرک دھبہ دکھائی دے رہا تھا ——

ماحول پُراسرار بھی تھا اور غمناک بھی۔

"یہ بھیا کا دوست ہے۔ بیچارہ پاگل" —— رشیدہ تاسف سے بولی ——

روشن بیٹھ گئی —— مگر وہ درد جسے وہ سینے میں چھپا کر لائی تھی۔ اس کا اظہار وہ کس طرح کرے —— اس کی زبان گنگ سی تھی —— تفریقی لکیر ناچ رہی تھی —— ناچے جا رہی تھی ——

رمبھا ناچ۔

"ایک بات پوچھوں ؟"

"ضرور پوچھو ——"

روشن اور زیادہ سنجیدہ ہو گئی۔ سامنے والے کواٹر میں جو بابو رہتے ہیں نا؟ کیا نام ہے اُن کا ——؟

رشیدہ کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ "اسلم"

"کام بھی کرتے ہیں کچھ ——؟"

"کام کی تلاش میں ہیں ——"

روشن پے در پے سوال کر رہی تھی۔ "اکیلے ہیں ؟"

"ابھی تک تو اکیلے ہیں ——"

"روشن رُکتے ہوئے بولی۔ "وہ یہاں بھی تو آتے ہیں ؟"

میری مصلحتیں یہ ناقص دماغ کب جان سکے گا ؟ پاگل صحن سے اُٹھکر دیوار کے ساتھ لگے ہوئے نیم کے درخت پر جا بیٹھا —— ابھی صبح دور ہے۔

"اسلم بابو بھیا کے دوست ہیں " رشیدہ پہلے سے بھی زیادہ کھل اُٹھی۔ بھیا انھیں پسند کرتے ہیں۔ اب تو تمھیں بتانا ہی پڑ گیا۔ وہ روشن کے قریب ہو بیٹھی۔

"کیا بتانا پڑے گا ؟" روشن چونک سی گئی۔

"بھیا چاہتے ہیں اسلم بابو یہیں آجائیں۔ ہمارے پاس ——

ہمارے بہت قریب ۔

روشن بوکھلا گئی ۔۔ " یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ " پھر اُس کا دل زور زور سے دھڑکنا شروع ہو گیا ۔۔ وہ سمجھ چکی تھی ۔۔۔ اشارے ۔۔ اشاروں کا مفہوم ۔۔ باتیں ۔۔ باتوں کا پس منظر ۔ ناکامی کے پہلے احساس نے اسے مجروح کر دیا ۔۔ وہ روئی نہیں ۔۔۔ وہ رو سکتی بھی نہ تھی ۔ عورت دوسری عورت کے سامنے اپنی ناکامی کا اعتراف کم ہی کیا کرتی ہے ۔ اور پھر روشن کی محبت ہی کیا ۔۔۔ یہ تو ذہنی اُلجھن تھی ۔ اعصاب کی لمحاتی وابستگی ۔۔۔ لاشعوری پیار کا رشتہ ۔ جس نے چند دنوں پہلے اُس کے ذہن کے اُفق پر مستقبل کی مسرتوں کا سورج چمکانا چاہا تھا ۔ لیکن جو حالات کی تاریک گھاٹیوں سے نہ نکل سکا نہ اُبھر سکا ۔ وہ بہت جلد اس غم کو بھول جائے گی ۔ احساس کی ناکامی کا غم دیرپا نہیں ہوتا ۔ جب ایک دائرہ ٹوٹتا ہے ، جب ایک احساس مجروح ہوتا ہے تو اُس کی جگہ دوسرا احساس جنم لے لیتا ہے ۔ وجود کا یہی تسلسل زندگی ہے ۔ جذبات کی یہی سموجیات ہے ۔ اور روشن ایک الھڑ لڑکی سادہ لوح ۱۸ سالہ کنواری دوشیزہ ؛ جس کا اپنا کوئی وجود نہیں ۔۔۔ نفسیاتی پس منظر نہیں ۔

وہ نہ جانے کس طرح بولی ۔ ؟ " بابو کو ان باتوں کی خبر ہے ؟ "

" بھیا نے بتا دیا ہو گا ۔ ؟ "

" تم بھی اس رشتے سے خوش ہو " ۔ ؟

رشیدہ سرور کے عالم میں تھی۔ جیسے وہ خود بھی اس سوال کی منتظر تھی۔

"سنتی ہو روشن؟" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ میں بہت پڑھی لکھی لڑکی نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ محبت کسے کہتے ہیں۔ میں نے کبھی ایسی باتوں پر غور نہیں کیا۔ تم بھی کبھی ان باتوں پر وقت آیا تو غور نہیں کرو گی۔ وہ ایک لمحہ کے لئے رکی۔ لڑکیاں ایسی باتیں نہیں سوچا کرتیں۔ مگر ان باتوں کے بعد بھی ہمارے دلوں میں ایک چور ضرور ہوتا ہے۔ پسند اور ناپسندیدگی کا سوال جب کوئی مرحلہ بن کر سامنے آتا ہے تو کسی کی آنکھوں کی نمی سے۔ کسی کی پیشانی کی شکن سے۔ کسی کے دلوں کے دکھ اور کسی کے ہونٹوں کے تبسم سے دل کا یہ چھپا ہوا چور جھانکنے ضرور لگتا ہے۔

روشن کو محسوس ہوا جیسے اس مثلث کے باہر کی ہر چیز لو دے اٹھی ہے۔ آج رات آسمان پر ستارے نہیں چمکیں گے۔ پچھلی شب میں خنکی بھی نہ ہوگی۔ اور کانجی کباڑوں کی شکستہ دیواروں کی دراڑوں میں جھینگروں کے وحشتناک سازینے، دودھ آلود فضا کا دامن تھامے صبح تک ان گنت غمناک نغموں کو جنم دیتے رہیں گے۔

"میں چلتی ہوں۔"

وہ چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پاگل نیم کی موٹی شاخ پر بیٹھا ہوا آسمان کے دور افتادہ گوشوں کو تک رہا تھا۔ اور ہوا

سسکیاں بھر رہی تھی۔

"ظالم انسانو! میری دنیا سے نکل کر کہاں جاؤ گے ——
قہر و غضب کا تازیانہ تمھاری پشت تک لہرا چکا ہے" پاگل کا موڈ ایک دم آف تھا!۔

"پھر آؤ گی نا؟" رشیدہ بڑی محبت سے بولی

"اب تو روز ہی آؤں گی۔"

پھر روشن چلی گئی

اُسے اپنے کواٹر کا ماحول بالکل تاریک نظر آیا۔ وہ بے سہارا ہو کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ اُس نے خود سے سوال کیا۔ پھر وہ تھوڑی دیر بعد بولی —"ماں! کتنا اندھیرا ہے۔ چراغ تو جلا دے۔

"پاگل ہو گئی ہے لونڈیا" ماں گرجی۔ کیا جلتا ہوا چراغ تجھے دکھائی نہیں دے رہا۔؟

جب وہ اپنے ناول کا آخری اور سنسنی خیز باب ختم کر چکا —
جب اُس نے فنی شعور کا گلا گھونٹ دیا۔ جب ادب دوست پبلشر کا مطالبہ پورا ہو گیا۔ جب اُس نے کھڑکی نما روشن دان سے باہر دیکھا تو رات ڈھل چکی تھی۔ اور کواٹروں میں ٹمٹماتے چراغ یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے روشنی کے ننھے دائرے قبروں کے گھُپ اندھیرے

میں دم توڑ رہے ہیں — اور گردوپیش کی ہر چیز پر غم انگیز دھواں چھا رہا ہے —

وہ ستانے کے لئے چارپائی پر لیٹ گیا — نگاہیں کاغذی کوارٹر کی کمزور چھت کا جائزہ لینے لگیں جو غالباً اگلی بارش تک زمین پر گر جانے والی تھی —

رشیدہ کے کوارٹر سے پاگل کی باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی — گاڈ اس وقت بہت جوش میں تھا — جب ہی اُس کی بے معنی باتیں فضا میں بکھر رہی تھیں — معلوم نہیں یہ سچ مچ کا پاگل تھا۔ یا جان کر پاگل بن گیا تھا — غمِ حیات کی تلخیوں سے فرار کا یہ آسان ذریعہ اُس نے سوچ سمجھ کر اپنایا ہو — ممکن ہے یہ سب فریب ہو — عظیم ترین فریب — مگر جن راہوں پر وہ چل رہا ہے، چلتا رہا ہے — جن وادیوں کو اُس نے عبور کیا ہے — وہ سب امتحان گاہیں ہیں — سخت ترین مراحل — جہاں حقیقتیں چھپی نہیں رہ سکتیں — وہ کاغذی کوارٹر کی کمزور چھت کا جائزہ لیتے ہوئے سوچ رہا تھا —

گاڈ — خدا — الیشور — بے خواب آنکھیں، افسردہ چہرہ — تخلیق — ایک غمناک ہیولہ — شعور و فکر سے عاری — احساسات سے مبرا — خدا — گاڈ، الیشور، جذبۂ مظلومیت کا برتر منتقمانہ احساس — جو کبھی روشن ہو جاتا ہے — کبھی تاریک — جو کبھی سماجی کرب کو اپنا کر دھاڑتا ہے اور کبھی سراج کی ظلمتوں میں ٹوٹا ہوا ستارہ بن کر غائب ہو جاتا ہے —

پھر اُسے محسوس ہوا جیسے آسمان سے ایک بہت بڑا ستارہ ٹوٹ کر اُداس فضا میں تحلیل ہو گیا ہے۔ جس سے رات کا پھیلا ہوا آنچل سُلگ اُٹھا ہے۔ اس تپش کو اس کی روح محسوس کر رہی ہے۔ اور اس کی روح اس وقت رشیدہ کے تصور سے ہم کنار تھی۔

رشیدہ کا تصور۔ رشیدہ کے احساسات، پیار، خلوص، زنجیریں اسے زنجیریں پھیلتی نظر آنے لگیں۔ بڑی بڑی آہنی زنجیریں۔ جو آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ بڑھتی جا رہی تھیں۔ اور جن کے سرے رشیدہ کے ہاتھوں میں تھے ــــ اُسے خود سے نفرت ہونے لگی۔ خود غرضی، جنس کی لاشعوری بے نام محرکاتی حس جو محبت نہیں ہو سکتی ــ معصوم رشیدہ جو اُسے بلندیوں کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ مگر وہ ان بلندیوں کو کس طرح اپنا سکتا ہے۔ جذبات اُس سے برگشتہ تھے سخت متنفر ــ نہ معلوم کیوں انکار اور گریز کے بعض پہلو اپنے دامن میں کوئی معقول دلیل نہیں رکھتے ــ لیکن اس کے بعد بھی ان کے وجود کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال اس کا بھی تھا۔

کیا اسے رشیدہ سے نفرت ہے؟ ــ اُس نے اپنے ذہن کو ٹٹولا ــ اور حقیقت بہت جلد اس پر آشکار ہو گئی۔

ایسی تو کوئی بات نہیں ــ اگر حالات درست ہوں وہ جذبات کی ناآسودگی کے تلاطم خیز دور سے گذر جائے تو اُسے رشیدہ سے محبت ہو سکتی ہے۔ اس کی روح میں ایک ایسی چیز ہے ضرور جو اسے

اس الھڑ لڑکی کے بارے میں کبھی کبھی سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مگر وہ اس سے والہانہ پیار کیوں نہیں کرتا؟ — جب آسمان پر شفق پھولتی ہے، ساحلِ سمندر سے آنے والی ہوائیں زلفوں کے نرم سہروں کی مہک فضا میں پھیلا دیتی ہے آسمان توس کے رنگوں میں ڈوب کر حدِ نظر تک نکھر جاتا ہے۔ جب چاند آسمان پر ستاروں کا روشن رباب لیے ان گیتوں کو چھیڑ دیتا ہے جو تمام تر بہشتی ہوتے ہیں اور رات اپنے سلونے چہرے سے نقاب الٹ کر نورانی بساط پر رقص شروع کر دیتی ہے اس وقت رشیدہ اُسے پوری شدت سے یاد کیوں نہیں آتی؟ — اس کی دوری کا تصور اُسے تڑپاتا کیوں نہیں؟ کیا وہ یہ تمام باتیں رشیدہ سے پوچھے؟ — وہ ان باتوں کا جواب دے سکے گی۔؟

پاگل اپنی بائبل کا نیا باب تصنیف کر رہا تھا۔ وحشت انگیز آواز رات کے سناٹے میں دور تک پھیل رہی تھی اور اب اُسے پہلی مرتبہ اذیت ناک آواز کے احساس کے ساتھ ہی اپنی تکلیف دہ تنہائی کا احساس بھی ہوا —

" اُمیدوں کے پھول کھلتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں۔ پہاڑوں کے سلسلے خزاں کی گھاٹیوں تک پہنچ کر دم توڑ دیتے ہیں۔ اے روح القدس دیکھنا یہ ہے شکست انسان کو ہوتی ہے یا گاڈ کو۔"

پاگل پر شاید جنون کا شدید دورہ پڑا تھا۔ دیکھنا یہ ہے شکست

انسان کی ہوتی ہے یا گاڈ کی" اے روح القدس! گاڈ ہارے گا اور نہ انسان ــــ دونوں ضدی ہیں ــ دونوں بہادر ــ جنگ جو ــ وہ اپنے اس خیال پر نہیں بڑھا ــ صدیوں سے یہ ایک دوسرے سے برہم ہیں صدیوں سے ان دونوں کے محاذ پر موت کی گرم بازاری ہے دونوں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں کائنات کو تباہی کے کنارے لے آئے ہیں ــ اے روح القدس ــ

اس کا وجدان جھنجلا گیا ــ تم ان دونوں کو اپنے حال پر چھوڑ دو! اور وہ رشیدہ ــ

اور وہ رشیدہ جس سے اُسے سخت شکایت ہے جو ابھی تک اس کے ذہن کے لئے برف بنی ہوئی ہے ــ کاش وہ شعلہ ثابت ہو سکتی یا کم از کم چنگاری ــ

اُس نے رشیدہ کے کوارٹر پر آکر آہستہ سے آواز دی ــ رشیدہ نے اُس کی آواز سُن کر اپنے چہرے پر لطافتوں کے رنگ بکھیر لئے ــ اور کمرے میں وہ یوں نظر آنے لگی جیسے قدیم یونان کی کوئی دیوی ابھی ابھی اس بے کواڑ کے تاریک کوارٹر میں آسمان کی بلندی سے اُتری ہے ــ اور اس کے سراپا سے تاریک ماحول جھلملا گیا ہے ــ

"میں آسکتا ہوں ؟"

"آئیے کھانا تیار ہو چکا ہے ــ"

وہ اندر آگیا ــ پاگل نے اُسے یوں گھور کر دیکھا جیسے اس کا آنا اسے

ناگوار گذرا ہے۔

"آج تو گاڈ صاحب بہت جوش میں ہیں"

وہ دوپٹہ درست کرنے لگی " جی ہاں! صبح سے تقریر جاری ہے۔

"میں تم سے شرمندہ ہوں۔ صبح تمہیں ناحق تکلیف دی۔ وہ روپے"

رشیدہ نے بات کاٹ دی "کیسی تکلیف؟ آپ ایسی باتیں نہ کریں"

"میں نے ایک سنسنی خیز ناول لکھا ہے۔ مار دھاڑ سے بھرپور"

اس کی باتوں میں مزاح تھا۔ "یہ دماغ توڑ ناول کل میں اپنے پبلشر دوست کو دے دوں گا۔

رشیدہ کے چہرے سے ہنسی غائب ہوگئی۔ اور اس کی آنکھیں زمین کی طرف جھک گئیں "تو کل آپ میرا قرضہ واپس کر دیں گے؟

"ہاں! کل شام تک۔"

"چاہے مجھے کتنی بھی تکلیف ہو؟"

"میں تمہارے جذبات کا احترام کرنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔ اس میں بہت حد تک تمہارے مخلصانہ اطوار کا دخل ہے" وہ نیچی نظروں سے کہتا رہا۔ "تم مجھ سے پیار کرتی ہو! لیکن یہ بھی تو سوچو! ہم دونوں اپنی جگہ غلطیوں کا ارتکاب بھی کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے ہمارے دل نہ معلوم کیوں شکست خوردہ نظر آتے ہیں"

رشیدہ نے اُسے پان بنا کر دیا۔ تھوڑے توقف کے بعد اسلم نے کہا "کہیں ایسا تو نہیں ہے ہم اعصاب زدہ ہیں۔ اور اپنی اپنی جگہ یہ جانتے

ہیں اگر آئندہ زندگی کے لئے ہم نے کوئی طرزِ حیات منتخب نہ کیا تو ہماری تباہی یقینی ہو جائے گی۔

پاگل نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ تباہی تو یقینی ہے۔ نئے انسان کی تعمیر پرانے آدم کی ہڈیوں سے ہو گی۔

رشیدہ متحیر نگاہوں سے اسلم کو دیکھ رہی تھی۔ پاگل خاموش ہو گیا تو اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"میری بات کا جواب دو! اپنی اعصاب زدگی کا کوئی جواز تلاش کرو! ـــ سوچو۔ اعتراف کرو۔ یا انکار ـــ ہم طوفان زدہ جہاز کے مسافر دکھائی دیتے ہیں۔ حالات کی تند موجوں نے جنہیں مایوسیوں کے ساحل تک پہنچا دیا ہے۔ اس ویران ساحل کے دامن میں صرف ہم دو سخت کوش زندگی کے نمائندہ ہیں۔ جن کے دل فرطِ الم سے پارہ پارہ اور زبانیں گنگ ہیں۔ سمندر کا دوسرا کنارہ ہماری نظروں سے اوجھل ہے ہمارے ماحول کی ساری وسعت اس موج تک ہے۔ جو ہمارے قدم چوم رہی ہے۔ یہاں سے زمین کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں اس وحشت ناک اور اُداس عالم میں ہم تنہا ہیں ـــ ایک دوسرے کا سہارا ـــــــ مجبوریوں کے خوف نے ہمیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے۔ اتنا قریب، جہاں ننگے جسم بھی ہمارے ضمیروں کے چٹکی نہیں لے سکتے ... مگر اس قربت کے باوجود رشیدہ ہمارے اندر جو کیفیت ہے وہ مضحکہ خیز ہے کیا تم اسے محبت کہتی ہو ــــ؟

رشیدہ کی کشادہ پیشانی پہ فکر کی سلوٹیں اُبھریں اور ہٹ گئیں — آنکھوں کی دل کش چمک ماند پڑی اور پھر اس کی جگہ رومان کی شبنمی تجلیوں نے لے لی۔

"اسلم نرم لہجے میں کہتا رہا — اگر ہمارے اچھے حالات ہوتے یا ہماری دنیا میں وسعت ہوتی ہم مقدروں کے خشک اور ویران ساحل کے قیدی نہ ہوتے تو شاید تم مجھ سے کبھی پیار نہ کرتیں — ممکن ہے ایسا ہی ہوتا — تم اپنے لئے ایک بہتر رفیقِ حیات کو منتخب کرتیں۔ اور میں —" اُس نے فقرہ پورا نہیں کیا۔ الفاظ کی کہکشاں فقروں کے آسمان پر نمودار نہ ہو سکی — وہ یہ سب کچھ اُس سے کہہ رہا تھا۔ جس کا شعور ان الجھنوں سے نا آشنا تھا۔ تکلیف دہ احساس کے ردِ عمل نے اسلم کو خاموش کر دیا — اعترافِ حقیقت کے یہ تیر صرف اس کا سینہ مجروح کر سکے۔

وہ سب خاموش تھے۔

خاموشی کے بے نام زنداں میں اسیر ہو جانے کے بعد ان دونوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں — پاگل کچھ اس طرح بیٹھا تھا جیسے سکون اور شانتی کا عظیم دیوتا یا وہ برگزیدہ و پُراسرار انسان جو دنیا کی بے چینیوں کو پاؤں تلے روند کر معرفت کے چشموں میں غرق ہو جاتا ہے۔

وہ سب خاموش تھے — دلوں پر چھائے ہوئے سکوت نے ان کی زبانوں پر تالے ڈال دیئے تھے — پھر چند لمحے بعد ماحول کی تصویر میں ایک

نیا رنگ اُجاگر ہوا۔

پاگل نے معرفت کے سمندروں کی موجوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "گاڈ نے بیر بہوٹی کی فطرت پائی ہے۔ اپنے وجود کو گم کر کے اُسے دل بھر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ اُس کی عظیم محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے مگر آج کل انسان اس سے گستاخی کرتا ہے اور گاڈ بیر بہوٹی کی طرح اپنی ساری شیتیں سمیٹ کر انسان کے وجود کو مصائب کے ریتیلے میدانوں میں بھٹکا دیتا ہے۔ اب میں انھیں سزا دینا چاہتا ہوں۔۔ بدترین سزا۔

رشیدہ نے دزدیدہ نگاہوں سے دونوں کا جائزہ لیا۔

"گاڈ ہر مسئلے پر قادر ہے۔ انسان مسئلوں کو اُلجھاتا ہے۔۔ گاڈ نے اُسے محبت دی۔ انسان نے اُسے نفرت سے بدل لیا۔ پاک خدا نے اسے اپنا جزو سمجھا لیکن اُس نے پاکیزہ رشتے کی ہر احساس کو ختم کر ڈالا۔۔ ہاہاہا۔۔ وہ پوری قوت سے ہنسا۔۔ اب انسان مسائل کی چکی میں پس رہا ہے۔ گاڈ کی فتح ہو رہی ہے۔ شک۔ بدگمانی، عزتِ نفس سے محرومی، قلبی واردات کا غلط اندازہ۔ میرے بدترین عذابات ہیں جنھیں میں انسانوں کا مقسوم بنا چکا ہوں۔ میرے خلاف سازش کی تھی نا۔۔ لعنتی شیطان سے رل کر۔ دیکھ لیا اس کا انجام۔

رشیدہ نے اسلم سے اپنایت کے لہجے میں کہا۔ مجھے اس سے

خوف آتا ہے ـــ نہ معلوم بھیا اسے کیوں سے آتے۔؟

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا" اُس کا ذہن ابھی تک اپنی کہی ہوئی باتوں میں اُلجھ رہا تھا۔

"آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" وہ شرماتے ہوئے بولی ـــ میں ان باتوں کا جواب نہیں دے سکتی۔ کبھی کسی لڑکی کو آپ نے ایسی باتیں کرتے دیکھا ہے؟ ـــ وہ قدرے رُکی اور یونان کی کسی شہزادی کی طرح تمکنت سے بولی۔ میرے بارے میں بھیا نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ مجھ سے پوچھکر کیا ہے۔ اب میں آپ سے کبھی کچھ نہیں کہوں گی۔

وہ تیزی سے اٹھکر مختصر سے باورچی خانہ میں چلی گئی ـــ گاڈ سنے جماہی لے کر گنگنانا شروع کر دیا۔ "کوئی یہاں گرا، کوئی وہاں گرا ـــ" اور اسلم بھی تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گیا۔ شکست خوردہ ذہن صرف اتنا جان سکا تھا کہ رشیدہ کی محبت جنس زدہ محبت نہیں ہے اور اس کے چہرے پر وہ قدسی نقاب ہے جو کبھی تار تار نہ ہوگی ـــ چاہے وہ بہتر حالات میں ہوتی۔ ایک معزز خاندان کی چشم و چراغ یا ایک غریب رکشا والے کی بہن ـــ وہ جہاں کہیں بھی ہوتی اس کا انتظار دیکھتی اور اس انتظار کی کوئی حد نہ ہوتی ـــ

کوارٹر کی تاریکی نے اُس کے وجود کو نگل لیا ـــ!!

آہٹ ـــ قدموں کی مانوس چاپ ـــ رات کی پیشانی سے سرکا ہوا

آنچل — رشیدہ کے کوارٹر میں باتوں کی دھیمی دھیمی آوازیں — ایک مثلث — ایک مکان — ایک مقام — ایک بیان، اور اس سے باہر کی ہر چیز اونگھتی ہوئی بے حس — بے جان ——

رشیدہ کے بھائی نے کھانا ختم کر کے اُس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ کچھ پوچھنا چاہتا ہے —— بہن بھائی کے رشتے کا پاس بھی پیار کے کتنے قرینے چاہتا ہے —

"بابو نے کھانا کھالیا —؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا —— ہاں!

"رشیدہ!" اُس نے باتوں کا آغاز کرنا چاہا —— تم اب بڑی ہو گئی ہو — میری منی سی بہن —

"اور پھر منی سی بھی —" رشیدہ شرارت سے بولی

"ہاں ہاں — منی سی —— جواب میرے گھر سے رخصت ہونے والی ہے ۔" اُس نے بڑے دل گداز انداز میں یہ بات کہی — میں تمھارا ہاتھ پکڑے عزت و رسوائی کے درمیان کھڑا ہوں —— میں نے تمھارے لئے جس شخص کو پسند کیا ہے وہ بھی ہماری ہی طرح حالات کا ستایا ہوا ہے —— اُس کا دامن بھی بالکل خالی ہے — وہ بھی ہماری طرح شرافت و انسانیت کے خالی کنستر کو بجا رہا ہے — تم اس انسان کے ساتھ خوش ضرور ہو گی — میں جانتا ہوں میں نے تمھارے لئے جو سودا کیا ہے وہ تمھاری روح کا سب سے قیمتی لباس ثابت ہو گا —

بھائی بہن کی باتیں مقصدیت کے گلاب کی طرح مہک رہی تھیں وہ بہت دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ رشیدہ کے ہونٹوں پر تبسم رنگ بن کر بکھرتا رہا۔ اور رشید اُسے سمجھاتا رہا۔ بتاتا رہا۔ باتیں ہوتی رہیں اُس نے اپنی بہن کے جسم کا سودا نہیں کیا ہے حالانکہ بہت سے غریب ایسا کرتے ہیں۔ دنیا میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ عارضی مسرت کا قلیل سا وقفہ بہن کی طویل زندگی کی قیمت نہیں بن سکتا۔ پستیوں میں آباد ہونے والے گھر، بلند و بالا محلوں پر جب کمندیں ڈالتے ہیں تو یہ کمندیں جل بھی جاتی ہیں اور رشتوں کے نازک آبگینے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور پھر جو ان بھائیوں کی زندگی میں بد نصیب بہن کی پلکوں پر سیّال نگینے چمکنے شروع ہو جاتے ہیں۔

"آپ یہ باتیں اُن سے بھی تو کریں۔۔۔ رشیدہ نے بڑی مشکل سے جملہ پورا کیا۔

پاگل نے پھر ہانک لگائی۔۔۔ اے روح القدس آئندہ سے روحوں کا لباس زر تار کفن ہوگا۔ جسم بکتے ہیں۔ جسم نہیں بکتے۔۔۔ بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی قیمت سود خوار یہودیوں کی جیب میں جا چکی ہے۔ پاک خدا پلکوں پر ستارے چمکانے پر بھی قادر ہے۔

رشیدہ کے بھائی نے مسکراتے ہوئے چارپائی چھوڑ دی۔۔ اور اسلم کے کوارٹر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ جہاں ایک بے چین دل۔ سکون نا آشنا ہستی بان کی چارپائی پر پڑی ہوئی کروٹیں بدل رہی تھی۔

کرنل قصار بایزید نے ٹیلیفون ڈائرکٹری میں اٹیلا کی فرم کا نمبر تلاش کر ہی لیا۔ ڈائل انگلی کی حرکت سے مطلوبہ نمبر پر گھوما۔

ہلو!۔۔۔۔۔

ہلو!۔۔۔۔۔

"میں کرنل قصار بایزید ہوں"

"کرنل مختار" مخالف سمت سے نسوانی آواز آئی۔

"ایک مرتبہ پھر سنیئے"۔ خاکسار کا نام کرنل قصار بایزید ہے۔ شکریہ۔

"ذرا جلدی کریں۔ میں اٹیلا مارکونی سے بات کرنا چاہتا ہوں"

اور پھر چند لمحے بعد اٹیلا کی مخمور آواز سنائی دی۔

کرنل تمار بایزید!

ڈارلنگ!

ڈارلنگ مت کہو۔ ٹیلی واپس آگئی ہے۔ اُسے معلوم ہوگیا تو۔ وہ حسین رات جسے تم نے غیر فانی بنا دیا تھا۔

اٹیلا کی آواز میں شرارت تھی ۔۔ فون پر ایسی باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔۔

آج ہاف ڈے ہے ۔ کرنل تھرکتے ہوئے بول رہا تھا۔ میرا مطلب ہے تنہائی میں تم بوریت محسوس کرو گی ۔۔ ٹھیک ڈیڑھ بجے میٹروپول کے بڑے گیٹ پر ملو۔۔ کیا سمجھیں ؟ مجھے صرف اخبار کے دفتر تک جانا ہے۔ بارہ کا وقت ہو چکا ہے ۔ اچھا ڈارلنگ رخصت ۔۔

کرنل نے جواب کا انتظار کئے بغیر چونگا ہاتھ سے رکھدیا۔

انگلش ٹبلروں کا خاص سلیقہ کھانے کے مزے کو دوچند کر دے گا۔ یقینی اٹیلا ایک خاص لذت محسوس کر سکے گی۔ اس کے پاس ڈیڑھ گھنٹہ تھا۔ اور اس وقفے میں وہ سرکاری کام کے ناخوش گوار فرض کو پورا کر دینا چاہتا تھا۔۔

دن کافی چڑھ چکا تھا۔

اپنے ناول کا مسودہ بغل میں داب کر دو دس بجے نکل جانے کے بعد بھی بارہ بج کر ۲۵ منٹ اور دو سیکنڈ میں سنڈیکیٹ کی پُر شور بس سے

ایکسپریس مارکیٹ تک آسکا تھا۔ بس سے اُتر کر اُس نے اپنے چہرے سے گرد صاف کی۔ سامنے دوکان پر بڑا سا بورڈ آویزاں تھا۔ جہاں اسے جانا تھا۔

شیخ اکرام الٰہی پرنٹر اینڈ پبلشر
کتابوں کے قدیم ترین تاجر

وہ دوکان کی سیڑھیاں طے کر کے کتابوں کے قدیم تاجر شیخ اکرام الٰہی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اور جب شیخ اکرام الٰہی کتابوں کے قدیم تاجر نے اسے اپنے سامنے موجود پایا تو کاروباری مزاج پُرسی کے بعد اس کی طرف ایک کرسی بڑھا دی۔ جس کی چاروں ٹانگوں میں بہت زیادہ فرق تھا۔ اور جس کا بید جگہ جگہ سے ٹوٹ چکا تھا۔

"ناول تیار ہے۔ جیسا آپ چاہتے تھے۔ سنسنی خیز۔۔ مار دھاڑ سے بھرپور۔۔"

"بہت خوب!" کتابوں کے قدیم تاجر ناول کا مسودہ سنبھالتے ہوئے بولے۔ "تو آپ نے آخر اسے مکمل کر ہی لیا۔ بس ایسی چیزیں پبلک پسند کرتی ہے۔ وہ ناول کا پہلا باب پڑھتے ہوئے جھومے۔ کیا کہنے ہیں اس ناول کے۔ حمید نے سعید کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ نقاب پوش نے سیٹی بجائی اور اُس کا مددگار آگیا۔ کتابوں کے قدیم ترین تاجر ہونے کی حیثیت سے وہ ناول کے اس باب پر مر مٹے۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ جانے کے لئے اٹھا تو اُس کی جیب میں

دو سو روپے تھے۔ جاسوسی ناول کا معاوضہ۔ شیخ اکرام الٰہی کی طرف سے ـــ

شیخ جی! اُس نے چلتے ہوئے سوچا۔ شکست ـ میری شکست، جادو نگار قلم کی شکست ـ اور اُس کا پہلا دن ـــ اب رشیدہ کا قرضہ بھی ادا ہو جائے گا ـ اور اپنی ضروریات کی تکمیل بھی ـــ لیکن اے میری شکست ـ اُس کا وجدان غم انگیز آواز میں چلایا ـ میری بے باک مددگار ـ آج سے تو میرے گیت اور فن کی نغمہ باریاں نہیں سُنے گی ـــ اب ہم دونوں ایک ساتھ بین کریں گے ـــ اور مرحوم جذبات کی قبریں کھودیں گے ـ رشیدہ کا قرضہ ـــــــ اس کی روح بوجھل بھی تھی۔ اور ہلکی بھی ـــ وہ آہستہ آہستہ سڑک پر چلتا رہا ـــ اور سڑک کے موڑ پر ایک شخص کھڑا ہوا ڈھیلا کر رہا تھا ـــ اُس کی نگاہیں سامنے والی بلڈنگ کی کھڑکی پر تھیں ـ جہاں ایک پارسی عورت کھڑی ہوئی اپنی گجراتن ہمسائی سے باتیں کر رہی تھی ـ اور وہ شخص ان دونوں کے سامنے کھڑا ہوا اطمینان سے ڈھیلا کر رہا تھا ـ ایک مقدس فعل نہ جانے کب سے جاری تھا ـــ وہ چلتا رہا ـــ اپنی شکست کے سہارے ـ دھوپ اس کے غم کی نم آلود دلیا کو خشک کرتی رہی ـ اور جب وہ اخبار کے دفتر کے سامنے رُکا تو اس وقت بھی وہ شخص ڈھیلا کر رہا تھا۔

کمرے میں ایڈیٹر کے سامنے ایک ساتھ دو کارڈ پیش ہوئے۔

ایڈیٹر کا اشارہ پا کر چپراسی نے کرنل قصار کے لئے کمرے کے دروازے

کھول دیئے۔ کرنل حسبِ عادت مسکراتے ہوئے اندر چلا گیا۔ پھر باتوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ قہقہے بلند ہوتے رہے۔ اور وہ باہر پڑی ہوئی کرسی پر بیزاری سے بیٹھا رہا۔ پچھلے دنوں اس روزنامے میں اُس کا مضمون شائع ہوا تھا۔ اور آج اُسے اس کا معاوضہ وصول کرنا تھا۔ کمرے سے برابر باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

کرنل کہہ رہا تھا

"دونوں ملک ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ بین الاقوامی حالات نے ترکی کو پاکستان کے قریب کر دیا ہے"

اُس کے سامنے آدمی آ جا رہے تھے۔ ہاکر۔ ایجنسی والے۔ اور چپراسی۔ جب اُن کے قدموں کی چاپ پھیلتی تھی تو کرنل کی باتوں کا شور مدھم پڑ جاتا تھا۔

"میرا ایک ضروری بیان جو کل تک آپ کو سفارت خانے کے ذریعے مل جائے گا۔ میں چاہتا ہوں اس پر آپ ادارتی نوٹ لکھ دیں"

اڈیٹر کہہ رہا تھا۔ ضرور ضرور —— اس بیان کو چھپ جانے دیں دونوں ملکوں کی دوستی امن و سلامتی کی ضامن ہے۔

ایکا ایکی دروازہ پھر کھلا اور چپراسی کے جانے پہچانے اشارے نے اُسے اندر آنے کی ہدایت دی۔ وہ اُٹھا اور اڈیٹر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

اڈیٹر نے اُسے کرسی پیش کی۔ انتظار کی زحمت قابلِ معافی ہے۔ یہ ہمارے مہمان کرنل قصار بایزید ہیں۔

کرنل قصار بائیزید غور سے اُسے دیکھنے لگا۔ اُس کی کشادہ پیشانی پر ملنساری کی لکیریں اُبھر آئیں۔ اُس نے بھی ترک کرنل کا جائزہ لیا۔

یہ لوگ عموماً حسین ہوتے ہیں

اڈیٹر کہہ رہا تھا۔ "آپ اسلم صاحب ہیں۔ ملک کے نوجوان مصنف"

دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا۔

کرنل کی آنکھوں میں آبنائے باسفورس کی اجیالی سحر انگڑائیاں لے رہی تھی حالانکہ اناطولیہ کی پہاڑیوں کے دامن میں پھیلی ہوئی خندقوں کے زمہریر اندھیرے اس وقت بھی اس کے ذہن کے دریچوں سے جھانک رہے تھے۔

"قیامِ امن کے لئے آپ کے ملک کی کوششیں لائقِ تحسین ہیں"۔ اڈیٹر نے مشرقی اخلاق کا مظاہرہ کیا۔

کرنل بے نیازی سے بولا۔ "جدید ترکی ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ ہر ملک کی ایک تاریخ ہوتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کی عظمت انسانی تہذیب کا کمال اس کے فکر و خیال کی معراج اگر کہیں بے نقاب نظر آتی ہے تو وہ تاریخ میں۔ اُس نے پہلی مرتبہ کرنل کے احساس برتری کے خلاف مورچہ لگایا۔

"جدید ترکی ہی نہیں ہم تمام ملکوں کے حالات کو تاریخ کے اس آئینے میں دیکھ سکتے ہیں"۔

"بہت خوب اسلم صاحب"۔ اڈیٹر نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔

تاریخ کے ان حالات کو اگر دیکھا جائے تو ایک منطقی تسلسل پیدا ہو جاتا

ہے ـــــ اور اسی تسلسل میں ہمارے تنقیدی نقطہ نظر کا پیکر اُبھرتا ہے۔

جیسا کہ مجھے معلوم ہے۔ پاکستان کے لوگ شاعرانہ خوبو کے مالک ضرور ہیں۔ مگر منطق و فلسفہ، یہ ان کے بس کا روگ نہیں ــــ کرنل نے اپنی شخصیت کے سہارے دونوں کو مرعوب کرنا چاہا۔

اُس کا لہجہ طنز آمیز ہو گیا۔ "معاف کرنا یہ عظیم قوم کے فرد کا نقطۂ نظر معلوم نہیں ہوتا۔"

"آزادی کے بعد پاکستان کے لوگ ذہین ثابت ہو رہے ہیں۔" کرنل نے باتوں کا دوسرا طریقہ اختیار کیا۔

"ہم کب ذہین نہیں تھے۔ سیاست، معاشرت، تہذیب، آرٹ، جملہ فنونِ لطیفہ کب ہمارا حصہ نہ تھے؟" جب یورپ کی قومیں موسیقی کی افسوں طرازِ دھنوں کی تخلیق سے ناآشنا تھیں۔ مسیح کی پیدائش سے بھی ہزاروں سال پہلے۔ سندھ کے نواحی علاقے اور مغربی گندھارا کی راجدھانی ٹیکسلا وتی میں اس وقت راگ وِدّیا کے سمندر رواں تھے۔

تاریخ کا مثلث زمان و مکان پر محیط ہوتا معلوم ہوا۔ وہ موثر و دلکش انداز میں بتاتا رہا۔

"مشہور رزمیہ نظم مہابھارت سب سے پہلے ٹیکسلا میں پڑھی گئی تھی۔

"مزے دار کہانی ہے۔" کرنل نے ناقابلِ اعتبار لہجے میں کہا۔

ممکن ہے ترک اپنے ملک کی قدیم تاریخ کے باعظمت پہلوؤں پہ کبھی یقین نہ کرتے ہوں۔ ٹیکسلا کی تہذیب وادیٔ سندھ کی نمائندہ تہذیب تھی۔

جس کی چنچل سندرتا سرائے کالو سے لے کر ان راہوں تک پھیلی ہوئی تھی جو وسط ایشیا کو پاکستان سے ملاتی تھیں۔

روزنامے کے ایڈیٹر نے اسے سگریٹ پیش کیا۔

کرنل منتظر رہا کہ وہ اور کیا کہے گا۔

" باسفورس کے کنارے آباد ہونے والے انسان بہت ذہین ہوتے ہیں اور سمجھدار بھی۔ لیکن مستند تاریخ کا کوئی موڑ یورپ کے کسی بھی ایسے ملک کی طرف ذہن کی رہنمائی نہیں کرتا۔ جہاں وادیٔ سندھ جیسی تہذیب ہو اور غیر فانی موسیقی کا زیر و بم ——— مصر کا بادشاہ سائرس ملکوں کو شکست دینے کے بعد یہاں آیا اور مشرقی گندھارا ٹیکسلا اور راولپنڈی کے علاقوں کو اپنی مملکت کا حصہ بنا کر چلتا بنا۔ واپس جاتے وقت بے شمار جواہرات اور پندرہ کروڑ کا سونا ہی اس کے ساتھ نہ تھا بلکہ وہ گائک اور مندر کی وہ دیویاں بھی تھیں جن کے چندن جیسے بدن راگ کے سانچوں میں ڈھل کر امر ہو گئے تھے۔

کرنل اور ایڈیٹر پوری دلچسپی سے باتیں سن رہے تھے۔ پاکستانی راگوں اور تخلیقی اقدار کی تہذیب ایک نئے اندازِ بیان کی مرہونِ منت تھی۔ کرنل جیسے دیو مالائی حیاتیاتی دور کی تمدنی عظمتوں کے بارے میں آج سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔

اسلم جذباتی ہو رہا تھا۔ " جب میں کوئی نغمہ سنتا ہوں جس کے سر پنچم کے ہوتے ہیں تو مجھے ہزاروں سال پہلے کی وہ داسیاں یاد

آجاتی ہیں جو مندر کے کھلے صحن میں زعفران زار لباس پہلے دیوتاؤں کے چرن چھوکر سنگیت کے سڑل چھولوں سے فضائیں معمور کر دیتی تھیں۔ دور دور تک کھتارا کی نغماتی سحر کاری آواز کے لوچ میں سما کر آکاش کی وسعتوں کو چوم لیتی تھی۔ معزز مہمان! اس نے سگریٹ کا طویل کش لے کر کہا۔ مشرقی گندھارا کی سندر داسیاں جن کے اپنے گیت اُن کی نجات کے ضامن تھے۔ جن کی موہنی صورتیں، پُر پیچ زلفیں اور نازک ہونٹ جوانی کے رسیلے پن کی شوبھا تھے اور آج ہزاروں سال بعد جن کی مقدس و پاکیزہ ہڈیاں مردہ تہذیب کے تاریک نہاں خانوں سے برآمد ہوتی ہیں۔ ہمارے عظیم قوم ہونے کی دلالت کرتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں میرے دیس کی لافانی تہذیب کا سلسلہ اور فنونِ لطیفہ کے سرگم ان نرمل کنھیاؤں کے بلیدان یا گر ہر دور میں وقت کے ساز پہ ثابت ہوتے رہے ہیں۔

کرنل کا مصنوعی احساسِ برتری زائل ہو چکا تھا۔ اب وہ ایک ذہین طالب علم کی طرح باتیں سُن رہا تھا۔

ایڈیٹر نے دونوں کو چائے پیش کی۔ بہت بہت نوازش۔ کرنل نے انکساری کے ساتھ کہا۔

اسلم صاحب دلچسپ انسان ہیں۔ میں تو انھیں اپنے ملک کی ثقافتی تاریخ کا دیباچہ کہوں گا۔ کرنل نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ کاش میں بھی اپنے ملک کی موسیقی کے بارے میں کچھ جانتا۔ اور اسی طرح بتا بھی سکتا۔

اسلم نے بحث کے موڈ میں کہا۔ ہمیں جاننا چاہیے۔ گم گشتہ جادوں

کی تلاش ہماری فطرت ہونی چاہیے۔ معاف کرنا کرنل صاحب! ہم لوگ بڑے جمالیات پرست بنتے ہیں۔ مخروطی اجسام اور بلوریں سینوں کی کی پیمائش کرتے ہیں۔ لچکتی کمروں اور سڈول پنڈلیوں کے کیف آور لمس کی برق پاش تاثراتی رانوں کے تجربات ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ گلاب جیسی رعنائیوں کے بکھرتے رنگ سے برہنہ جسموں کی تاریخ لکھتے ہیں اور اس تاریخوں کو فخر و مباہات کے ساتھ دوستوں کو سناتے ہیں لیکن اس سے ہٹ کر ہمارا ذہن ویرانہ ہوتا ہے چٹیل پہاڑ یا سلگتی ہوئی وہ چٹان جو کسی بدنصیب راہگیر کے سر پر آگرتی ہے جنس کی دلدلوں میں کھنس کر زندگی کے ساحلوں کو پالینا ایسا ہی ہے جیسے ایک نورے کو دیکھکر مریخ کے جغرافیہ پر تبصرہ شروع کر دیا جائے۔ اور اصرار بڑھا تو پھر ہمیں سکوت اختیار کر لینا پڑتا ہے۔ سوالی ذہن کم مایہ سکوت کا شکار ہو کر بھری محفل میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے۔

اڈیٹر نے اپنے لئے چائے کی ایک اور پیالی بنائی۔

"وہ گندھارا کی موسیقی ہو یا وسطی یورپ کی سازآفرینی۔ مگر ان تمام نغمات کا تخلیقی چشمہ ایک ہے۔ یہ تمام انسانوں کی مشترکہ دولت ہے۔"

کرنل نے سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر کرسی پر پہلو بدلا۔ "ایک مختصر سی ملاقات۔ جو مدتوں یاد رہے گی۔"

"میں بھی آپ لوگوں سے اجازت چاہوں گا۔" اسلم جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

ایڈیٹر نے ایک بند لفافہ اسے پیش کیا جس میں غالباً اس کے شائع شدہ مضمون کی قیمت تھی۔

کرنل نے ایڈیٹر کی وساطت سے اپنی خواہش کا اظہار کیا

"کیا شام تک مسٹر اسلم میری رفاقت گوارہ کرسکیں گے؟"

"میں ایک جذباتی سا انسان ہوں ۔ فربہ اندام احساس کی دھمک جسے کوئی کوئی ہی برداشت کرسکتا ہے۔"

کرنل ہنس دیا۔ تھری ایکسرم کا گلاس مجھے دھمک کے اثر سے محفوظ رکھے گا۔ تھری ایکسرم کا حیات افروز گلاس یا اسکاچ کے دو پیگ۔"

ایڈیٹر کلب کی چوتھائی چائے پی چکا تھا۔ "ہاں ہاں! کیا حرج ہے۔ تھری ایکسرم کا گلاس یا اسکاچ کے دو پیگ۔" ایڈیٹر نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس خاکسار کے نام کا بھی ایک پیگ ان میں شامل کر لیں۔

انگریزی جاز کی دل کش موسیقی، چھلکتے ہوئے گلاس۔ رنگین ماحول سہانے جلوے۔ کنوارے تبسم کے ادھ کھلے پھولوں کی مہک۔ تمدن زندگی کی بلندی، اور آبنائے باسفورس کے روپہلے ساحلوں پر ترکی کے ان گنت سلطانوں کے پُراسرار محلوں کی باتیں۔ سلطان محمد ثانی، سلطان بایزید، عبدالحمید دوم، اور —— اور ——

وہ دونوں ایڈیٹر سے رخصت ہو کر باہر آگئے۔ جہاں کرنل کی نیلی کار گرم دنوں کی شرربار دھوپ میں کھڑی ہوئی چمک رہی تھی۔

کرنل نے کار میں بیٹھتے ہوئے سوچا۔ فرانسیسی شراب کے چھلکتے ہوئے گلاس اور اٹیلا مارکونی کا جسم ایک پائیدار امن کا تابندہ عنوان ہے ــــ

کار کا انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ اور پھر مشینی شور فضا میں پھیل گیا۔

ٹھیک دو بجے۔ ہوٹل میٹرو پول کے کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے بوڑھے مینجر نے ریسور اٹھا کر ملائمت کے ساتھ کہا۔

"میں آپ کا زادم تھا مس لینڈ" یہ ہوٹل میٹرو پول ہے۔

ٹیلیفون پر رابرٹ ٹیل بول رہی تھی۔ کرنل قصار بایزید کو آپ بُلا سکتے ہیں ؟

خاتون۔ ٹھیک دو بجے وہ یہاں لنچ کھانے تشریف لائیں گے۔

یہ مجھے بھی معلوم ہے۔۔ ٹیل کی آواز میں تیزی تھی۔

خاتون! وہ ابھی آتے نہیں ہیں۔ بس آتے ہی ہوں گے۔ چند منٹ تک یا اس سے کم وقفے میں۔۔ تھوڑی دیر بعد آپ پھر تکلیف کریں۔

اور کرنل قصار بایزید گرد م دنوں کی شرر بار دھوپ میں ہوٹل میٹرو پول کے بڑے گیٹ پر اپنی نیلی کار میں بیٹھا ہوا اٹیلا کا انتظار دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ والی نشست پر اسلم خاموش بیٹھا ہوا آسمان کی طرف گھور رہا تھا۔ آسمان شرر بار تھا۔ دور اُفق کی وسعتوں تک کوئی ہلکا سا بادل بھی نہ تھا۔

اسی طرح دس منٹ گذر گئے

کرنل نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ ہزار افسوس ہے یہ چھوکریاں کتنی غیر ذمہ دار ہوتی ہیں۔

ناگواری کا احساس زائل کرنے کے لئے اُس نے سیٹی بجانا شروع کر دی۔ وقت گذرتا رہا۔ لمحے نیم جان سانپ کی طرح آہستہ آہستہ رینگتے رہے۔ سڑک پر اجنبی سائے لہراتے رہے۔ اور کرنل کی سیٹی کا شور تیز ہو کر دھیما ہوتا گیا۔

"اب کوئی اُمید نہیں۔ مفت کی بوریت" کرنل گہرے تاسف کا شکار ہو چکا تھا۔ دو پہر کی تقریب کا انجام محض بوریت۔

اسلم کرنل کی بوریت پر مسکرا رہا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے چھوکریاں چھوکروں کو فریب دیتی آئی ہیں۔ اسلم اور کھلا۔ عورت سے ایک لمحے کی دوری بھی مرد کو میسر نہ آئی تو وہ اس کی ضرورت کو اس شدت سے محسوس نہ کرتا۔ عورت مرد کے پاس ہوتی ہے تو وہ اُسے جذبات کے تقاضوں کی سستی پیداوار سمجھتا ہے۔ اور بس — لیکن یہ اگر کنارہ کشی اختیار کرے تو مرد بور ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

کرنل خاموش رہا

لمحاتی افسردگی کو اپنے قہقہوں سے مٹانے کے لئے کوئی اور پروگرام۔ اسلم نے کرنل کے شانوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ سڑکوں پر ان جانے سائے رات گئے تک لہراتے رہیں گے۔ انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی جائیں گی۔ لیکن وہ جسے یہاں آنا تھا بھٹک کر کہیں اور جا نکلی ہے۔

کرنل بدمزہ ہو رہا تھا۔ ناقابلِ معافی جرم۔ بے کار وعدہ۔ مسٹر اسلم! اُس نے کار اسٹارٹ کر دی۔ ہم پہلے اندر جا کر اسکاچ کی بوتل شہید کریں گے۔۔ یہ بدمزگی تو دور ہو۔"

کار ہوٹل کے بڑے دروازے کے سامنے رُک گئی۔ کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے بوڑھے منیجر نے کرنل کو آتا ہوا دیکھ کر ریسیور منہ کے پاس لا کر کہا۔ آپ کا خادم تھامس لینڈ۔ عجیب اتفاق ہے۔ آپ کے فون کے ساتھ کرنل صاحب آ گئے۔ وہ ہال کے وسط میں ہیں۔ لیجئے آپ بات کریں۔۔ اُس نے ریسیور کرنل کو تھما دیا۔

کرنل قصار بایزید

خلوص و محبت کے کئی پیار۔ مخالف سمت سے رابرٹ ٹیل کی آواز آئی۔۔ میں کئی مرتبہ فون کر چکی ہوں، لیکن ہر بار ہوٹل کے بوڑھے تھامس کی آواز نے مجھے مایوس کر دیا۔

کرنل نے اپنے شانوں کو حرکت دی۔ میں تم سے سخت ناراض ہوں۔

میں شرمندہ ہوں۔ خلاف توقع فرسٹ سکریٹری کے ہمراہ مجھے جانا پڑ گیا۔۔ بالکل اچانک، یقین کرو ڈارلنگ! میرے علم میں دورے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

کرنل کے چہرے پر شگفتگی آ گئی۔۔ معافی ایک شرط پر دی جا سکتی ہے۔

کسی شرط کا اظہار کرنے سے پہلے یہ سُن لو۔ ناگ تمھارے اعزاز میں آج ایک پارٹی ہے۔ بس چند دوست میری سہیلیاں اور تم۔ میرے لئے یہ

سزا کافی نہ گی ؟ ۔ ٹیل کی آواز میں دلی خلوص کا رچاؤ تھا ۔

سزا مناسب ہے ۔ اور حسین بھی ۔ اعلیٰ پارٹی چند دوست ، اور تمھاری سہیلیاں جو یقیناً تمھاری طرح حسین ہوں گی ۔ اور جب شراب کے گلاس اُن کے ہاتھوں میں ہوں گے تو وہ باسفورس کی رقصاں موجیں نظر آئیں گی ۔

ٹیل کی آواز جذباتی تھی ۔ تو بس ابھی آجاؤ ۔

کرنل متحیر ہو کر بولا ۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے ۔ پارٹی تو شام کو ہو گی ۔

ٹیل بضد تھی ۔ کوئی بات نہیں ۔ میں اٹیلا سے مل چکی ہوں وہ بھی آنے والی ہے ۔ تم بھی آجاؤ ۔ شام تک خوب گذرے گی ۔

کرنل چونک کر بولا ۔ تم اٹیلا سے مل چکی ہو ۔

وہ غریب تمھارے پاس آرہی تھی ۔ لیکن میں نے اسے روک دیا ۔ وہ تم تک آجاتی تو پھر تم گرفتار نہیں ہو سکتے تھے ۔

بایزید نے بلند قہقہہ لگایا ۔ تو یہ تمھاری سازش تھی ۔ خیر میں آرہا ہوں میرا پتہ نوٹ کرلو ۔ محمد علی سوسائٹی کے پاس ۔ بینک اسکوائر کے عقب میں پیلے موڑ پر سفید کوٹھی ۔ یہاں میرے علاوہ میری سہیلیاں بھی تمھاری منتظر ہیں ۔

کرنل ایک دم کچھ سوچ کر بولا ۔ میرے ساتھ ایک مہمان بھی ہے ۔ جسے میں شام تک خود سے دور کرنا نہیں چاہتا ۔

یہ اور خوشی کی بات ہے ۔ میں اسے اپنے لئے سعادت سمجھوں گی ۔

سمجھے ڈارلنگ! دیر مت کرو۔

کرنل بچوں کی طرح ہنسنے لگا۔

مجھے اجازت دو۔۔ ٹیل نے کہا

کرنل نے رسیور اپنے ہاتھ سے رکھ دیا۔ اسلم ہال کے وسط میں کھڑا ہوا کمرے کی دیوار پر آویزاں اس تصویر کو انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ جس میں ایک مدقوق سی عورت اپنے کمسن بچے کو سوکھی چھاتیوں سے چمٹائے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عورت خوف کا مجسمہ تھی اور دور افق پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بادلوں کی کثیف چلمن سے موت جھانک رہی تھی۔ وحشت زدہ ماحول ماتما کی بیچارگی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اور کوندتی ہوئی آڑی ترچھی بجلی معصوم زندگی کے ادھ کھلے پھول کو جلا دینا چاہتی تھی۔ ماتما پریشان تھی۔ ماتما اداس تھی۔ ماتما سوگوار تھی۔ مصور کے رنگوں نے ایک دل دوز حادثے کو کینوس پر ہمیشہ کے لئے اُجاگر کر دیا تھا۔ تصویر میں ماتما اُداس تھی اور کثیف بادلوں کی چلمن سے موت جھانک رہی تھی۔

"چلو چلیں"۔

اسلم چونک سا گیا۔ اب کہاں؟

ٹیل کے مکان پر۔۔ جہاں شاداب اجنبی جسموں کی قربت بھی مل سکے گی اور ایک روحانی خوشی بھی۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے کافی بے تکلف ہو چکے تھے۔

وہاں ایک دو نہیں ہزاروں کے کئی مجسمے ہوں گے ۔ رابرٹ ٹیل ایک قدر شناس عورت کی دعوت جو خود بھی متنوع صورتوں کی دل دادہ ہے ۔ کرنل زور سے ہنسا ۔ تم ٹیل کو نہیں جانتے ۔ وہ بہت گرینڈ عورت ہے ۔ ایک دم بیوٹی فل ۔ کسی شاعر کا خواب ۔ اس کے جسم کے مرمریں اعضا ، کچے بادام کی طرح خوش نما دکھائی دیتے ہیں ۔ وہ چلتے چلتے رُک کر کہنے لگا ۔ کاش اُس کے سامنے کے دو دانت بڑے نہ ہوتے ۔ معلوم نہیں عورت تمھارے اعصاب کی ڈکشنری کے لیے کونسا معنوی حرف ہے۔

اسلم نے قدرے لاپرواہی سے کہا ۔ میں عورت کو تفصیلی طور پر کبھی نہیں سمجھ سکا ۔ وہ ایک فلسفہ ہے ۔ جدید بھی اور قدیم بھی ۔ تم اسے کچی بادام کہتے ہو ۔ ٹھیک ہے اپنی اپنی سمجھ ہے ۔ لیکن میں اسے اعصاب کی چپچپاہٹ سمجھتا ہوں ۔

بڑا ہال عبور کر کے وہ باہر آگئے ۔ کرنل نے کار اسٹارٹ کر دی ۔ اسلم نے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی ۔ ہوٹل کے مین گیٹ پر پٹھان چوکیدار کھڑا ہوا نسوار کی چٹکی اپنے منہ میں ڈال رہا تھا اور ملیشیا کا غلیظ کُرتا اُس کے مضبوط جسم پر جھول رہا تھا ۔ گھیر دار شلوار جمے ہوئے میل کی تہ سے اکڑ کر اُس کی ٹانگوں میں کھڑکھڑا رہی تھی ۔ یہ ہوٹل میٹروپول کے بڑے گیٹ پر پہرہ دینے والے پٹھان چوکیدار کا حلیہ تھا ۔ جس کی گھنی مونچھیں کمان کی طرح تنی رہتی تھیں اور جو اپنے گاؤں سے ہزاروں میل دور پڑا ہوا اس وقت نسوار کھا رہا تھا ۔ اسلم کا جی چاہا وہ اس سے جا کر کہے خاناں ! تم اپنی مونچھوں کو

نیچا کر لو۔ اور اس میل سے اٹی ہوئی کھڑکھڑاتی شلوار کی دھجیاں کر کے ہوٹل میٹروپول کے بڑے ہال میں بکھیر دو۔ تاکہ بوڑھا تھامس لینڈ تمہیں گالیاں دے اور پھر تم اُس کا گلا دبا دو!

وہ پٹھان چوکیدار سے یہ سب کچھ کس طرح کہتا۔

پٹھان انسان تھا۔ اور انسان کو بھوک لگتی ہے۔ اور اس بھوک کو مٹانے کے لئے چور چوری کرتا ہے۔ سرمایہ دار بلیک مارکیٹ کرتا ہے۔ اور غریب پٹھان چوکیداری کرتا ہے۔ برتن صاف کرتا ہے۔ رات کی پھیلتی ہوئی تاریکی میں دلاّلی کرتا ہے۔

برق رفتار کار بہت آگے نکل گئی۔

خوش حال خاں خٹک کے دیس کے چوکیدار کی خوفناک مونچھیں نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔

مثلث — دائرے — موڑ — سڑکوں کے پیچ و خم — دوڑتی ہوئی کار — بھاگتا ہوا ماحول — کرنل قصار بائیں یدا سٹیرنگ کو ہر لحظہ خفیف سی حرکت دے رہا تھا۔ ہر موڑ پر اس کے ہاتھوں کی جنبش ایک کمان کا زاویہ اختیار کر لیتی تھی — اور موڑ گذر جاتا تھا۔ یہ بھدی صورتیں۔ فٹ پاتھ پر رینگتے ہوئے انسانوں کے ہجوم۔ اپاہج فقیروں کے گروہ۔ زندگی کا اثاثہ ہیں۔ اجنبی جسموں کے تصور سے کھیلنے کے بجائے اسلم کا ذہن گردوپیش کی چیزوں سے اُلجھ رہا تھا۔

ہر شے گرد آلود ہے۔ غموں کی گرد نے زندگی کے خدوخال کو چھپا رکھا

ہے ۔ لیکن گرد میں یہ چھپے ہوئے خد و خال بھی کتنے ضروری ہیں۔ جیسے ان میں ایک ضروری پن ہے ۔ جیسے یہ سماج کی سب سے بڑی ضرورت ہیں اور ان سے آس پاس کی بوجھل فضا کی تکمیل ہو رہی ہے ۔ موٹر دوڑ رہی تھی ۔ سڑکوں پر چلتے ہوئے انسان پیچھے رہتے جا رہے تھے اور کرنل کے ہاتھوں کی جنبش سے اسٹیرنگ مسلسل حرکت میں تھا ۔ شوں، شوں، شوں، کرنل نے گاڑی کو آہستہ کر دیا ۔ تم ٹھیک کہتے ہو ، عورت ہر دور میں ایک فلسفہ رہی ہے ۔ پہیلی ۔ جسے سوچنا پڑتا ہے ۔ سمجھنا پڑتا ہے۔ اور پھر اس فلسفہ کے ایک ایک ورق پر مرد کو اپنے دستخط ثبت کرنا پڑتے ہیں ۔

اب موٹر صدر سے گذر رہی تھی

میں اسی خیال سے کنوارا رہنا پسند کرتا رہا ۔ اور وہ تمھاری دوسری بات چیچپا ہٹ والی ! وہ مجھے جچی نہیں ۔ معاف کرنا میرے دوست ۔ ہم ایک دوسرے سے کافی بے تکلف ہو چکے ہیں ۔

کرنل کی آواز سے وہ چونک کر اپنے ماحول میں واپس آگیا ۔ اسے ذہنی تکلیف ہوئی ۔ خیالات کا سلسلہ جب ٹوٹتا ہے تو روح کراہ اٹھتی ہے ۔ یہی حال اُس کا بھی ہوا ۔ ہر چیز اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ۔ وہ رینگتے ہوئے انسان ۔ ہجوم ۔ غم آلود فضاؤں کی نمی ۔ سب اس کی نظروں سے اوجھل تھے ۔

"کیا سوچ رہے تھے ؟" کرنل نے دھیمی آواز میں کہا ۔ میں اُسی خیالی

سے ساری عمر گزارا رہا۔ میری عمر کے ۴۵ سال گذر گئے۔ ایک خاص کرب اس کی آواز میں تھا۔ تم سوچو نا! ۴۵ سال کم نہیں ہوتے ہیں خلیل کہ اب میری روح تنہائی کے خار دار بستر پر سوتے سوتے تھک چکی ہے۔

رابرٹ ٹیل اور اٹیلا مارکونی کی شب تاب رفاقت کے بعد بھی؛ اسلم نے طنز کیا۔

یہ تو سب کچھ حادثاتاً ہو رہا ہے۔ اس نے موٹر کا گیر بدلا۔ زندگی کی ان گنت سلگتی ہوئی تنہا تنہا راتوں کے مقابلے میں ایسی راتیں بہت کم ہیں۔ میں اعصاب کی ایک بے روح مشین کی طرح اپنے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ خندقوں میں اور کبھی خندقوں سے باہر۔۔۔ جنس کی اتھلی نالیاں میرا مقدر رہیں۔ اور وہ بھی کبھی کبھی۔ کرنل کہتا رہا۔ جنگ جویانہ طبیعت کے بھرپور تقاضے جب تک جواں رہے۔ میں نے ایسی باتوں کی طرف دھیان نہیں دیا۔ کسی سہارے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مگر جو سیال اندھیرے خندقوں کی گہرائیوں سے اُبھر کر مجھے ورثے میں ملے ہیں اب وہ ہر ساعت مجھے ڈراتے ہیں۔ ایک بے نام خوف میرے اعصاب میں کپکپی پیدا کئے ہے۔ میں سوچتا ہوں اس اذیت ناک کیفیت کے کیا معنے ہیں۔ پھر میری روح زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر چیختی ہے۔ سہارا۔ سہارا۔ ایک مخلصانہ رفاقت۔ ایک ایسی ہستی جو حواس و ہوش پر اپنی مہکتی ہوئی زلف لہرا دے۔ میرے

وجود کو اپنی باہوں میں سمیٹ لے۔ اپنے پیار کی گرمی سے میرے سینے کو حرارت کدہ بنا دے۔ اخلاص و محبت کی شمعوں سے ان اندھیروں کو شکست دیدے جن میں میری روح بھٹک رہی ہے۔ طبیعت کا یہ بھٹکاؤ مجھے پستی کی طرف لے جا رہا ہے یا بلندی کی طرف۔ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ مگر میں جانتا ہوں انجام کار مجھے شکست ہوگی۔ میرا ذہن چیختا ہے۔ بوڑھے کرنل سو جاؤ۔ رات بہت خنک ہے کنوارے جسموں کے لیے تمہارا لمس اذیت ناک اور مضحکہ خیز ہوگا —

سو جاؤ۔ نادان فوجی! یہی اندھیرے تمہارے رفیق ہیں۔

اسلم کو کرنل سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ عجیب اذیت ناک کیفیت ہے۔

اذیت ناک کیفیت۔ کرنل نے فقرہ دہرا کر موٹر کی رفتار کو تیز کر دیا۔ یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا اس احساس نے مجھے اس وقت بھی جھنجوڑا ہے۔ جب میرا شبستان کسی سیمیں وجود سے روشن ہوتا ہے۔ اور میں اس کی منتشر زلفوں کے گھنیرے سائے میں سستاتا ہوتا ہوں۔ اس موقعہ پر بھی میری روح ناگہانی طور پر چیختی ہے بہارا، ناپائیدار رفاقت۔ اور یہ آواز سن کر میں سناٹے میں آ جاتا ہوں اور سیمیں وجود سے گھنیری زلفوں کے سائے سے مجھے وحشت ہو جاتی ہے۔

کرنل افسردہ ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غم کی قوس کے سائے پڑ رہے تھے۔ اور آنکھوں میں آبنائے باسفورس کے طوفانوں

کی نمی تھی۔ کار دوڑ رہی تھی ۔ ماحول پیچھے کی طرف بھاگ رہا تھا ۔ آدمیوں کے ہجوم گذرتے جا رہے تھے ۔ اور کرنل اپنی بارعب شخصیت کے جسم پر سے ایک ایک کپڑا دور کرتا جا رہا تھا۔ اور جب اُس نے آخری عبا اُتار کر پھینکی ہے تو اُس کے مظلوم خدوخال پوری طرح اُبھرے ہوئے تھے ۔

"بہت ممکن ہے۔ تم مجھے جذباتی انسان کہو۔" وہ اب بھی آہستہ سے بولا۔ میں یہ سب کچھ سوچتے ہوئے بھی شادی کیوں نہیں کر لیتا ۔ ابھی رفیق حیات مل سکتی ہے ۔ خیر ان باتوں کو جانے دو۔ میں پھر کبھی تفصیل سے تمھیں بتاؤں گا ۔ ابھی تو ہمیں دعوت میں شریک ہونا ہے۔ جہاں چند دل کش صورتیں ہماری منتظر ہوں گی ۔ وہ ایک دم شگفتہ ہو گیا۔

کار محمد علی سوسائٹی کے وسط سے گذرتی ہوئی بینک اسکوائر کے سامنے والی کوٹھی کے احاطے میں جا کر رک گئی ۔ جہاں رابرٹ ٹیل اور ایٹلا موٹر کے انجن کی آواز سن کر پہلے سے استقبال کے لئے موجود تھیں ۔ ایٹلا رابرٹ سے چند قدم پیچھے تھی اور اُس کے چہرے پر ذرہ برابر بشاشت بھی نہیں تھی ۔

اوہ ڈارلنگ تم آ گئے ۔ رابرٹ ٹیل نے وفور مسرت سے کہا ۔ ہاؤ آر یو کانٹ ویل تھینک یو ۔ ڈارلنگ ۔ وہ دونوں موٹر سے اتر پڑے انھیں کمرے میں انجان صورتیں نظر آئیں جو منجسا نہ انداز میں انھیں گھور

رہی تھیں۔ دلفریب مسکراہٹیں بکھیرتے وہ سب کمرے میں آ گئے۔ انھیں ایک خوش گوار مہک کا احساس ہوا۔ ڈرائنگ روم کے ماحول میں جمالیاتی حسن پروان چڑھ سکتا تھا۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہاں کوئی واہیات چیز نہ تھی۔ فرش پر خوش نما قالین۔ وسط میں رکھے ہوئے آرام دہ صوفے۔ آتش دان پر کنواری مریم کا مجسمہ، اور شاہ بلوط کی لکڑی کی خوبصورت صلیب، دیواروں پر آویزاں چند تصویریں، اور اسٹینڈ پر رکھا ہوا ٹائم کا تازہ پرچہ، دروازوں پر لہراتے ہوئے نیلے کانچ کے پردے۔ اور صوفوں کے ساتھ رکھی ہوئی غیر ملکی ساخت کی چھوٹی چھوٹی تپائیاں۔

کرنل نے اٹیلا اور رابرٹ ٹیل کا اسلم سے تعارف کرایا۔ اجنبی صورتیں اپنی باری کی منتظر رہیں۔

ٹیل نے صورت حال کو فوراً بھانپ لیا۔ کرنل قصار بایزید۔ اور آپ کے دوست مسٹر اسلم۔ اجنبی چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

کرنل نے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

مس بولینا۔ بیگم فصاحت یار جنگ۔ حق نواز۔ مس عائشہ اور بی گل آفریدی ٹیل نے آپس میں ایک دوسرے کو متعارف کرا دیا۔

وہ سب ہاتھ ملا کر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ابھی ان لوگوں کی اجنبیت کا احساس پوری طرح زائل نہیں ہوا تھا۔ اٹیلا بجھی بجھی نظر آ رہی تھی۔ اور اس کے برابر والی کرسی پر پارسی لڑکی جولینا کرنل کے چہرے پر نظریں

گارڈے زرتشت کی شریعت کے بارے میں بیٹھی غور کر رہی تھی۔

اسلم نے سوچا۔ خواجہ حق نواز سب سے علیحدہ بیٹھا ہوا۔ منتظر ہے کہ کوئی لڑکی اُسے بھی لفٹ دے۔ باتیں کرے۔ اور پھر وہ خالص کاٹھیاواڑی انداز میں اُسے جواب دے۔ بیگم فصاحت یار جنگ بار بار اپنی ساری کے پلو کو درست کر رہی تھیں۔ اس نے سوچا۔ یہ لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں، اگر میں ان محترمہ سے بات کروں تو یہ فوراً کہیں گی۔ حضت۔ میں پرسوں آپ سے ملی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ ملاقات تو آج ہو۔ اور بیگم فصاحت یار جنگ کہیں " حضت میں آپ سے پرسوں ملی تھی نا ـــــ

حیدرآبادی بیگم کے پہلو میں عائشہ تھی۔ جسے پنجاب دیس کی فضاؤں نے لوریاں دے کر پالا تھا۔ جو راوی کے کنارے پروان چڑھی تھی۔ اور جو اب چناب رنگ تھی۔ بیاّر تھی۔ سلفے کی روشن لاٹ تھی۔ ہیر کے رسیلے ہونٹوں کا نغمہ تھی۔ رانجھا کی بے خواب آنکھوں کی تلاش تھی۔ ڈھولک کی تھاپ پر تھرکنے والے ناز آفریں جسم کا لوچ تھی۔ جو کبھی کوٹھے کوٹھے پھر کر اپنے چن کو بلاتی ہوگی۔ مگر جو اب۔ مسلسل آٹھ گھنٹے دفتر کے بے کیف ماحول میں رہ کر تجارتی چٹھیاں ٹائپ کرتی ہے۔ پھر دن فائلوں کے گرانبار ڈھیروں سے اُلجھتی ہے۔ اور جب تھک جاتی ہے۔ تو ٹائپ سے اپنا سر لگا کر گنگنانے لگتی ہوگی۔

سے یارنوں مندانہ بولیں   میری بھادیں گُت پٹ لیں

اب ایک چہرہ اور رہ گیا تھا   آفریدی۔ اسلم دل ہی دل میں

ہنسنا۔ اُس کا جی چاہا۔ وہ اس آفریدی خاتون سے تڑے ماشے کرے۔ اور فضا میں بندوق داغ کر کہے۔ مرحبا، مرحبا، اے جانِ جہاں۔ تم امارا محبوب اور ام تمھارا محبوبہ۔ قسم بخدا کہ تم طوت حسین۔ مرحبا۔۔۔ معاً اُس کے ذہن نے ایک اور نقطہ کو جنم دیا۔ ایک سانپ سی لکیر کو اُبھارا۔ پھر یہ لکیر بے کواڑوں والے کوارٹر میں رہنے والی رشیدہ کی پرچھائیں میں تبدیل ہو گئی۔ اس ماحول میں رشیدہ کا خیال۔ لاشعوری اُلجھن بیدار ہو گئی۔ وہ جھنجھلا گیا۔ گہری ہمدردی محبت تو نہیں ہو سکتی۔ اُسے اپنے سینہ کے قریب ایک جلن سی محسوس ہوئی۔ رشیدہ کا فرض۔ اُس کے بھائی کا پیار۔ بندشیں، زنجیریں۔ اُس نے اس محفل سے بھاگ جانا چاہا۔ اُس کا دل ہوا۔ وہ ابھی رشیدہ کو سب کچھ بتا دے۔ وہ اُس سے کہے۔ تم میری ذہنی حالت کو سمجھتی کیوں نہیں۔ میرے پاس تمہارے لئے عظیم ہمدردی ہے۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں تم خوش رہو۔ تمہیں خوش دیکھنا میری سب سے بڑی حسرت ہے۔ لیکن یہ حسرت محبت کیوں نہیں بنتی؟ اسی لئے تو میں کہتا ہوں۔ میرے جذبات کی نا آسودگی تمہیں تباہ نہ کر دے۔ میں تم سے کبھی پیار نہیں کر سکوں گا۔ یہ نفسیاتی اُلجھاؤ ہے۔ جو کبھی پیار نہیں بن سکتا۔

رابرٹ ٹیل کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ آپ کی آمد صد ہزار خوشیوں کی باعث ہے۔ مگر آپ تو خاموش ہیں۔

کرنل نے خوش طبعی سے کہا۔ خاتون۔ ابھی ابھی آپ چونکا دینے والی

باتیں سُنیں گی۔ مسٹر اسلم سے جب میں اخبار کے دفتر میں مِلا تھا تو آپ کا کمزور سا وجود، میری توجہ کا مرکز نہیں بن سکا تھا۔ لیکن آپ کی گرانڈیل باتوں نے مجھے چاروں خانے چت کر دیا۔

جولینا جھجکتے ہوئے بولی۔ چونکا دینے والی باتوں کا آغاز ہو جانا چاہیئے

کرنل نے اٹیلا کو دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ آپ بھی تو خاموش ہیں، کھوئی کھوئی نہ جانے کس عالم میں ۔

میں عرض کروں حضت، اسلم نے بیگم فصاحت کو زچ کرنا چاہا۔ عالمِ خیال میں بطخوں کے بال بھی تو مونڈے جا سکتے ہیں۔

اٹیلا کے سوا باقی سب ہنسنے لگے۔ حق نواز کے بے ہنگم قہقہوں کا شور غالباً کسی کو پسند نہیں آیا۔ اور عائشہ کی ہنسی پھلجھڑی تھی۔ بی گل آفریدی، ماحول سے بے نیاز ٹائم کے اوراق الٹ پلٹ کر رہی تھی۔

اور جولینا آسمانی دھنک کی طرح بکھری جا رہی تھی۔

جولینا کی آواز میں لوچ تھا۔ چونکا دینے والی باتوں کا آغاز مبارک ہو،

بیگم فصاحت پا رجنگ ہوئے ہے. بولیں۔ حضت باتوں کا یہ سلسلہ اب جاری رہے۔

بی گل آفریدی پشتو میں انگریزی بول رہی تھی۔ مسٹر کی باتیں تو بندوق کی گولیاں ہیں۔ ایک دم تھری ناٹ تھری کی گولی۔

حق نواز مہیا یا۔ اپن کو یہ فقرہ بازی بہت پسند آتی ہے۔

وہ سب باتیں کر رہے تھے۔ لیکن اٹیلا مارکونی بدستور خاموش تھی۔ جیسے

وہ قصداً ٹیل کی موجودگی میں کسی سے بھی بے تکلف ہونا نہیں چاہتی تھی ۔

ابھی اجنبیت کی دیوار پوری طرح گری نہیں ہے ۔کرنل نے اٹیلا کو مخاطب کرنا چاہا ۔ اٹیلا نیم دلی سے مسکرائی اور پھر اس نے رابرٹ ٹیل کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے مہمانوں کی تواضع کے لیے اسے اشارا کیا ۔

یہ کوتاہی نادانستہ عمل میں آئی ہے ۔رابرٹ ٹیل جانے کے لئے کھڑی ہو گئی ۔آپ بھی کہیں گے میں عجیب عورت ہوں جسے مہمانوں کی تواضع کا بھی خیال نہیں ۔

ٹیل گہرے نیلے رنگ کا اسکرٹ پہنے تھی ۔

میں ابھی حاضر ہوتی ۔ وہ جاتے ہوتے بولی ۔ اور گہرے نیلے رنگ کے سیکڑوں بلبلے ساعتوں کے سمندر میں اُٹھے اور نذر آب ہو گئے ۔

معلوم نہیں عورتوں کی اکثریت گہرے رنگ کیوں پسند کرتی ہے ۔ گہرا سرخ ،گہرا سبز ،گہرا نیلا ۔ جولینا کا لباس بھی سرخ تھا ۔ شاید اُسے بھی گہرے رنگ پسند تھے ۔

جولینا دسمبر کا گلاب معلوم ہو رہی تھی جو رمحر بہ فضا میں ایک دہکتا ہوا انگارا بن کر کھلتا ہے ۔ اسلم سب کے لباسوں کا جائزہ لے رہا تھا ۔ یہ عورت نہیں ہے ۔ جولینا لڑکی نہیں ہو سکتی ۔ یہ شفق ہے ۔ شام سے پہلے نمودار ہو جانے والی اجیالی شفق ۔ جسے اس کی مرضی کے خلاف جولینا بنا دیا گیا ہے اور جو اب رنگ بن کر کمرے میں بکھری جا رہی ہے ۔

بی گل آفریدی ساٹن کی سنہر شلوار پہنے اسے یوں نظر آئی جیسے

ابھی ابھی وہ چنبیلی کے پھولوں کی مہک بن کر خنک ہوا کے جھونکوں میں مل جائے گی۔ اور رومانیت کی وادیاں اُسے آوازدیں گی۔" اسے بی گل آفریدی اس ہریالی کو یہاں، بکھیردے۔ یہاں تیرے الھڑ محبوب کے نغموں کا بسیرا ہے۔ یہاں تنہائیوں اور یادوں کا ملاجلا درد زندگی کا قیمتی اثاثہ ہے۔ بی گل آفریدی ابھی تک ٹائم کے اوراق اُلٹ پلٹ رہی تھی۔

حیدرآبادی بیگم۔ شاید نظام کی چھن جانے والی عظیم دولت کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ اے کاش کنجوس نظام اس دولت میں سے کچھ انھیں کو دیدیتا۔

اٹیلا۔ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھی۔ اور حق نوازان سب کے درمیان یوں بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے ابھی کوئی لڑکی اُس کے مستک پر ہاتھ پھیرکر یوں سا کہے گی۔ برخوردار سیاہ مرچ کا جھاڑ کیا ہے۔ اور عائشہ۔ عائشہ۔ اسلم نے یکبارگی محسوس کیا۔ اس کے کپڑوں کا رنگ گہرا نہیں ہے۔ ہلکا دھانی فراک۔ ایسی ہی شلوار۔ اور شانوں پر پڑا ہوا باریک دوپٹہ۔ اسلم کا جی چاہا۔ وہ اس سے پوچھے۔ تم گہرے رنگ کیوں پسند نہیں کرتیں۔ ٹیل کا گہرا نیلا فراک تم نے دیکھا ہے۔ اٹیلا کے اسکرٹ پر تمھاری نظر نہیں پڑی۔ حیدرآبادی بیگم، جولینا، اور بی گل آفریدی بھی گہرے رنگوں کی کان ہیں۔ لیکن تمھاری پسند ان سب سے مختلف کیوں ہے۔ تم سرسوں کا پھول کیوں بنی ہوئی ہو۔ جاننت

میں کھلتا ہے .. اور پھر کھیت کی فضا کو مہکا دیتا ہے۔

کمرہ عارضی سکوت کے پایاب دریا میں ڈوبا ہوا تھا۔ اجنبیت کی دیوار ایک دوسرے سے تعارف کے بعد بھی گر نہیں سکی تھی۔۔ جذبات کی انجان کیفیت سب کے چہروں سے عیاں تھی۔ تکلف کی مہین چادر اسے چھپا نہیں سکی تھی۔ اٹیلا اب بھی خاموش تھی۔ اور کرنل اس کی خاموشی سے خود ایک نفسیاتی الجھن محسوس کر رہا تھا۔ ممکن ہے وہ بھی سوچ رہا ہو۔ آج کی پارٹی میں اس کی توجہ کا مرکز ٹیل کو ہونا چاہیے یا —— پولینڈ کے فلسفی کی محبوبہ — اٹیلا کو ... جس کے آوارہ جسم میں ابھی تک بھرپور رعنائیاں تھیں —

کرنل خاموشی سے تنگ آکر بول اٹھا — میں نے تمھارا کافی انتظار دیکھا۔ مس اٹیلا انتظار کی تکلیف اذیت ناک تھی۔

اٹیلا پھر نیم دلی سے مسکرائی۔ ٹیل نے مجھے دفتر سے ہی اپنے قبضہ میں لے لیا تھا — جیسے وہ کنویں میں سے بول رہی تھی۔ افسوس ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آج کی پارٹی اس کی تلافی کر دے گی۔

کرنل نے اس کے چٹکی لی — تم نے ٹیل سے میری شکایت تو نہیں کی — وہ جذباتی عورت ہے' ایک دم برہم ہو جانے والی۔ اور ایسی عورت سے مجھے بہت خوف آتا ہے۔

تو آپ ٹیل کو مشین گن سمجھتے ہیں۔ اٹیلا کے لہجے میں طنز بھی تھا اور مزاح بھی —

کرنل نے مختصراً کہا۔ بس یہی سمجھ لو۔

میری شکایت بے معنی ہو گی۔ اُنیلا کی آواز میں استہزا کا عنصر تھا۔ اور پھر ٹیل ایسی عورت بھی نہیں۔

ان دونوں کی باتوں کے پس منظر میں جو کچھ بھی تھا۔ وہ سب سمجھ رہے تھے۔

جنس زدہ چہروں کے خد و خال سب سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ اس لئے بیگم فصاحت یار جنگ، قصداً اپنی توجہ آتش دان پر رکھی ہوئی صلیب پر مرکوز کئے تھیں۔ جولینا اپنے تنفر جیسے اسکرٹ کی شکنیں دور کر رہی تھی اور بی گل آفریدی کوئی پہاڑی نغمہ گنگنا رہی تھی۔ اور حق نواز بدستور مراقبے میں تھا۔

"ہم دونوں رابرٹ ٹیل کے مجرم ہیں"۔ کرنل آہستہ سے بولا

انیلا نے کرنل کے اس مذاق کو پسند نہیں کیا۔ جواب اُس کی زبان پر آ کر رُک گیا۔ کمرے میں کوئی اور نہ ہوتا تو وہ کرنل سے انتہائی ترش روئی سے کہتی۔ گناہ کسی خدا رسیدہ راہب کی عبا تو نہیں ہے۔ جو صرف نیک بندوں کے جسم ہی پر فٹ آ سکتی ہو...... یہ تو گناہ ہے۔ گناہ ـــــ جو سب کا مشترکہ اثاثہ ہے۔ رات کی تنہائیوں میں ٹیل گناہوں کی رعنائیوں کو اپنا سکتی ہے تو کوئی اور بھی انھیں اپنے دامن میں سمیٹ سکتا ہے۔ گناہ کی جھولی سب کے سینوں پر جھک آتی ہے۔ اناطولیہ کے پہاڑوں میں کھدی ہوئی خندقوں میں پیٹ کے بل رینگنے والے

کرنل — یہ چولی سب پہن سکتے ہیں۔

عائشہ کی خوبصورت آواز سُنائی دی۔

اتنی بہت سی مشین گنیں —؟

رابرٹ ٹیل کمرے میں آچکی تھی۔اور اُس کے پیچھے ملازم تھا جو اسکاچ کی بوتلیں اور گلاسوں کو اُٹھائے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

کرنل نے زور دار نعرہ لگایا۔ یو۔آر۔اے جیول۔ڈارلنگ، ان گنوں کو اب ہم بڑے خلوص سے چلائیں گے۔

جواب میں ٹیل مسکرادی۔ ملازم نے اسکاچ کی بوتلیں اور گلاس درمیانی میز پر سجادیئے۔ پہلا دور شروع ہوا۔اور جب ان سب نے اسلم کو شریک ہونے کے لئے کہا تو اُس نے حق نواز کی طرح اپنے مستک کو ہلاکر پینے سے انکار کردیا۔اُس نے کبھی شراب نہیں پی تھی۔اس سلسلے میں وہ ایسا ہی تھا جیسے معاشقے کے معاملے میں حق نواز جس کا کاٹھیاواڑی چہرہ مصر کی کسی ممی کی طرح غیردلکش تھا۔

اصرار بڑھتا گیا

کرنل نے کہا۔تم سینٹی میٹل ہو۔ایک دم سینٹی میٹل۔

ڈی گل آفریدی کی آواز میں پہاڑوں کی گونج تھی۔ معاف کرنا۔ قسم خدا کی۔ امارا محبوب اس طرح انکار کرتا تو ام کھون کردیتا۔

اٹیلا اور ٹیل کو یہ انکار عجیب سا معلوم ہوا۔

تم ایک بہت بڑے مذہبی انسان ہو۔ ٹیل آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔

مگر یہ سچائی سے فرار ہے۔ شراب بھی آخر اسی دنیا کی ایک چیز ہے۔

عائشہ دو پیگ پی چکی تھی۔ اس سچائی کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے بہت سے انسان خوف کھاتے ہیں۔ ابھی ہمارے ذہنوں سے عقائد کا بخار دور نہیں ہوا ہے۔

کرنل کے پینے کی رفتار سب سے تیز تھی۔ ہم سب بہادر ہیں۔ آگ کو بھی پی سکتے ہیں۔ دنیا کی ایک عظیم سچائی کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں کتنے ساغروں کو توڑنا ہوتا ہے۔

حق نواز پست آواز میں کہہ رہا تھا۔ شراب اپن پر کوئی اثر نہیں کرتی اور یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے بیوی بچوں کو یاد کر کے رونا شروع کر دیا۔ جو غالباً اُس کی اوباشی سے تنگ آکر ایک طویل عرصہ سے اپنے نانا کے یہاں مقیم تھے۔

بیگم نفاست یار جنگ نے اپنی ساری کے پلّو سے اُس کے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے خالص، حیدر آبادی لہجہ میں اُسے تسلّی دی۔ حضت ایک جام مسٹر اسلم کی بزدلی کے نام اور سہی۔

ملی جلی آوازوں کا گولا چھوٹا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس محاذ پر ہماری شکست، اٹل صداقت کی شکست ہے۔

کرنل نے فوجی لہجہ میں اٹیلا کو حکم دیا۔ اس محاذ کو تم سر کرو۔ یہ ساری توپیں، ساری گنیں تمھیں دی جاتی ہیں۔

اٹیلا نے زندہ دلی سے سب کو فوجی سلیوٹ کیا۔ ٹیل نے خالی

گلاس میں اسکاچ انڈیل کر اٹیلا کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ یہ لو آتشیں توپ۔ اب مزا یہ ہے اس کا دھماکہ ہم سب سنیں۔

سنیئے تو ___ اسلم ملائمت سے بولا۔ جس میں کسی حد تک اخلاقی خوشامد بھی تھی ___ میں اب تک حیران ہوں۔ شراب کو سچائی سے کیا واسطہ ___؟ وہ زور سے ہنسا۔ اگر کل آپ لوگ کہیں ہمارے جلتے ہوئے سگریٹ عالمی امن کے روشن مینار ہیں تو اس دلیل کو کون مانے گا اور واقعیت کی دنیا میں سگریٹ کا رتبہ برتر و بلند کس طرح ہو جائے گا۔

اٹیلا اپنی جگہ سے اٹھ چکی تھی ___ اسلم بدستور کہہ رہا تھا، اور سب کے چہرے مسکراہٹوں، قہقہوں اور شگفتگی کے آئینہ بنے ہوئے تھے۔

ہمیں ایک دوسرے کی مرضی کا خیال رکھنا چاہیے ___ میں اس کے پینے سے یوں گریز نہیں کرتا کہ مذہباً یہ حرام ہے ___ میں اس قسم کے کسی جواز کا قائل نہیں ہوں۔ وہ قدرے رکتے ہوئے بولا ___ یہ میرے لئے تکلیف دہ عادت بن سکتی ہے، اور اذیت ناک مزا ___ اس کا روز روز کا پینا۔ میری استطاعت سے باہر ہوگا ___ آج کے بعد میں فطرتاً اس سے محروم رہوں گا۔

اٹیلا ایک لمحہ کے لئے جھجکی ___ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے ___ غم سے سنولائی ہوئی صورت ___ کثرتِ استعمال سے گھسے ہوئے کپڑے ___ اور ان میں لپٹا ہوا ایک نحیف وجود ___

کرنل چوتھا پیگ ختم کرتے ہوئے چلایا ___ ہر استدلال کو ٹھکرا کر آگے بڑھ جاؤ ___ اگر اس نوجوان نے سچائی کا راستہ نہیں دیکھا ___ تو تلخ حقیقتوں کا

بھرپور اظہار کون کرے گا۔ اٹیلا۔ نہیں۔ کرنل، عائشہ۔ نہیں۔ نہیں، کوئی بھی نہیں۔ ہم لوگ فطرتاً بزدل ہیں۔

اٹیلا اسلم کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ اس کے ہاتھوں میں گلاس تھا۔ اور اس کی نظریں اسلم کے چہرے پر تھیں۔ وہ خود بھی سرور میں تھی۔ شراب اس کے اعصاب کو بھی سُن کر چکی تھی۔ اور جب ان دونوں کی نظریں ملیں، تو اٹیلا نے دیکھا جیسے اسلم کی روح مدتوں سے پیاسی ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں انتظار کی جوت ہے۔ نہ معلوم کیسی نہ معلوم کس کے لیے۔

اٹیلا کی آواز میں شفقت جاگ اٹھی۔ پی لو۔ یہ زندگی ہے۔ تم اسے عارضی زندگی سمجھ کر ہی پی لو۔

اسلم نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ایک جوان عورت، چھلکتا ہوا گلاس۔ دوستوں کا اصرار۔ اس نے اٹیلا کو دیکھا۔ جو قوس کی طرح جھکی ہوئی اسے تک رہی تھی۔ اور جس کی سانسوں کا لمس اس کے خون میں حل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ پیاس بھڑک اٹھی۔ نفسیاتی الجھاؤ کے صحرا میں اٹیلا کا دیا ہوا شراب کا گلاس، اس کے لئے منزل بن گیا۔

اب زہر بھی پلا دو۔ اسلم کی آواز میں بیچارگی تھی۔ اٹیلا نے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ کرنل بچوں کی طرح شور مچانے لگا۔ خالی گلاس اس نے قالین پر لڑھکا دیا۔ شراب کی پہلی تلخی نے اسے بدمزہ کر دیا۔ اور وہ اٹیلا کو معصومانہ نظروں سے دیکھ کر مسکرا اٹھا۔

یہ بہت بُرا ہوا۔

اٹیلا اسلم کے پہلو میں بیٹھ گئی

حیدر آبادی بیگم نے کہا اس خوشی میں دوسرا پیگ، ابھی سہی۔ اور پھر وہ پیتا رہا۔ ایک۔ دو۔ تین۔ سب اُس کا ساتھ دیتے رہے۔ ٹیل بے تحاشہ پینے کے بعد ہچکیاں لے رہی تھی۔ گل آفریدی اب تک کئی گلاس توڑ چکی تھی۔ اور عائشہ کبھی کبھی کسی پنجابی گیت کا بول گنگنانے لگتی تھی۔

میرے یار توں منداں نہ بولیں

ٹیل کرنل سے راز و نیاز میں مشغول ہو گئی۔ کراچی سے جانے کے بعد میرا موڈ آف رہا۔ دنیا کی بوریت میرے حصہ میں آگئی تھی۔

کرنل بھی عشق کے موڈ میں تھا۔ ڈارلنگ۔ تمھارے جانے کے بعد میری کوئی رات تنہا نہیں گذری۔ میں۔ میں بہت تیرے کی۔ بات دماغ تک آئی اور غائب ہو گئی۔ خیر۔ تم مجھے پھر بھی یاد آتی تھیں۔

جولینا کو ابھی سے گھر جانے کی فکر دامن گیر تھی۔ پچھلی رات کو اُسے گھر تک چھوڑنے کے لئے حق نواز کی رفاقت بھی اُسے منظور تھی۔ اور اس سلسلے میں وہ آپس میں معاہدہ بھی کر چکے تھے۔

بیگم فصاحت یار جنگ بہادر سقوط حیدر آباد کے اندوہناک تاریخی مسئلہ پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے لئے کئی بار نظام پر لعنتیں بھیج چکی تھیں۔ لیکن ہر بار کوئی اُن کی بات کاٹ دیتا تھا۔

اسلم خاموش تھا۔ اور اٹیلا بار بار اُس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ جہاں امڈتے ہوئے اندھیرے بھی اُسے حسین نظر آ رہے تھے۔ وہ جوان تھی۔ اسلم ہوش میں تھا۔ اُس کی باتوں میں ذہانت تھی۔ شراب اُس کے اعصاب پر ابھی تک کوئی اثر نہیں کر سکی تھی۔

غنی نواز سگریٹ کا دُھواں اُڑا کر اُسے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اٹیلا ایک عجیب سے احساس کی گتھیاں سلجھا رہی تھی۔ اسلم دوسرے مردوں سے کتنا مختلف تھا۔ اُس نے اب تک نہ تو کسی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اور نہ اُس کی خوبصورتی کی تعریف ہی کی تھی۔ یہ اُس کی زندگی میں شاید پہلا موقعہ تھا۔ جب وہ کسی مرد کی احترام انگیز توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ آخر اُس نے اسلم سے کہدیا۔ میں تمھاری خوبیوں کی معترف ہوں۔

اسلم کے ہونٹ کھُلے۔ قطعی نہیں۔ میں کبھی اچھا آدمی نہیں ہو سکتا۔ ایک معزز خاتون کی عارضی رفاقت میری بُرائیوں پر پردہ ڈالے ہوئے ہے۔

عائشہ نے پھر ایک پیگ تیار کر کے آہستہ آہستہ پینا شروع کر دیا۔ اُس کی آواز رُباب پر گائے ہوئے نغمہ کی طرح کمرے میں گونجی۔ یہ سب غیر ضروری باتیں ہیں ...... اس سے تو بہتر تھا ہم ہانک لگانا شروع کر دیتے۔ میرا چورن سب سے —— اُس نے ہو بہو کسی چورن والے کی نقل کی۔

بی گل آفریدی نے سا تو اس گلاس بھی توڑ دیا۔ ام بخدا یہی سوچ رہا تھا۔ پھر وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ ہمارا محبوب کتنا ظالم تھا۔ سنگ دل

عائشہ نے جیسے کچھ نہیں سنا۔ ان قہقہوں کو بھی نہیں۔ جو بم کے گولے کی طرح۔ چاروں طرف پھٹ رہے تھے۔ وہ بہت زیادہ جذباتی ہو گئی تھی۔ میں سوچتی ہوں .... ہر روز، میرا ذہن سوال کرتا ہے، یہ موسم اس قدر بے کیف کیوں ہے۔ اب بھی میں یہی کچھ سوچ رہی ہوں کاش آسمان کی وسعتوں پر جھومتا ہوا ابر چھایا ہوتا، اور بھیگی ہوئی خوش گوار ہوا کھڑکی سے اندر آکر میرے آنچل کو چومتی ہوتی۔ اس ہوا میں زمین کی سوندھی خوشبو بھی ہوتی، اور چنبیلی کے پھولوں کی مہک بھی۔۔

حق نواز اپنے گول مٹول چہرے کو کئی زاویوں میں تقسیم کئے بڑے انہماک سے عائشہ کی باتیں سن رہا تھا۔ اور کرنل ٹیل کے شانوں پر سر رکھے تائید میں اپنا ہاتھ نچا رہا تھا۔

وہ کہتی رہی۔ پھر میں اس کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو جاتی جہاں رابرٹ ٹیل ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں رکتی ہے۔

ٹیل نے کمرے کی کھڑکی پر نظر ڈالی۔

میرے چاروں طرف رومانیت کے پردے پڑے ہوں۔ ہلکے ہلکے سبز پردے۔۔ اور مجھے۔ اپنے دل میں۔ تنہائیوں۔ یادوں۔ اور۔ محبت کا ملا جلا درد محسوس ہوتا ہو۔ اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ اور ہر ستی بوند دل میں میری چھتی۔ درد آشنا یادیں۔ سر جھکائے کھڑی

ہوں ––

حق نواز سب سے زیادہ متاثر ہو رہا تھا – اور بی گل آفریدی آٹھواں گلاس توڑ کر اپنی ندامت کا اظہار کر رہی تھی – جولینا دیکھ رہی تھی۔

مجھے برسات بہت زیادہ عزیز ہے – عائشہ کی آواز میں رومانیت کا رچاؤ تھا –– یہ موسم اپنے ساتھ رنگ و بو کا طوفان لایا ہے –– میں جذباتی ہوتی جا رہی ہوں – پھر وہ تکلیف دہ آواز میں بولی – مجھے ایک پیگ تو دو ––

حق نواز تعمیل حکم میں فوراً اُٹھا

عائشہ نے گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا – گرم دنوں کی شرربار دوپہروں میں ہمارے چہروں پر گرد کی جو تہیں چڑھاتی ہیں – یہ موسم انہیں دھو دیتا ہے – بجلی کی چمک – اور – اُمڈتے ہوئے بادلوں کا شور بہت سی باتوں کو زبان تک لے آتا ہے – وہ باتیں جنہیں ہم اپنے دلوں میں چھپائے ہوتے ہیں – اور جن کے بغیر زندگی ایک لمبی چوڑی گالی بن جاتی ہے – وہ سانس لینے کے لئے رُکی – مجھے برسات کا موسم بہت زیادہ پسند ہے – میں چاہتی ہوں پانی برسے – موسلا دھار بارش بازار سے خریدے ہوئے اصولوں کے زہریلے غازے کو بہا دے – اصل خدو خال اُبھر آئیں – اور پھر – میں انتظار دیکھوں ، جو کبھی ختم نہ ہو – یہ ایک سچائی ہو گی – ابدی سچائی –

شام کے سائے بڑھتے جا رہے تھے – اور خنک ہوا چلنا شروع

ہو گئی تھی کمرے پر سناٹا طاری تھا۔ بہت زیادہ پی لینے کے بعد اُن کے اعصاب تھک سے گئے تھے۔

عائشہ کہہ رہی تھی۔ یہ تنہا میری آرزو نہیں ہے۔ انتظار سب دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں۔ جو کبھی نہ کبھی کسی کا انتظار دیکھ چکے ہیں۔ پھر وہ خاموش ہو گئی۔ اس کا خوبصورت چہرہ کسی چھپے ہوئے احساس کی غمازی کر رہا تھا۔ شراب کے اعصابی عمل نے اسے بُری طرح تھکا دیا تھا۔

اسلم نے بڑی دیر بعد اٹیلا سے کہا۔ میں تمہارا ممنون ہوں۔ تمہارا نام۔ معاف کرنا۔ میں نے کہا تھا نا۔ تم اٹیلا ہو۔ یاد آیا۔ تم اب سے پہلے بھی مجھ سے ملی تھیں۔ زندگی کے کسی ویران دامن پر۔ اب وہ بہکتا جا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے۔ جیسے تم میری بہت پرانی رفیق ہو۔ یہ زندگی کا پہاڑی راستہ ہم دونوں نے ایک ساتھ طے کیا ہے۔ اُسے ایک بڑی سی ہچکی آئی۔ مگر میں جس زندگی کا نمائندہ ہوں۔ میں جس سماج کی قابلِ نفرت اکائی ہوں۔ وہاں تم جیسی لڑکی نہیں آسکتی۔

اٹیلا نے اُس کے شانوں کو تھپ تھپایا۔

وہ ماحول۔ صرف رشیدہ کو جنم دے سکتا ہے۔ جس کا بھائی رکشہ چلاتا ہے۔ اور اپنی بہن کے لیے ایک اچھے بَر کی تلاش میں رات کے سناٹے میں دعائیں مانگتا ہے۔ اُسے اپنا دماغ چکراتا ہوا معلوم ہوا۔ اُف۔ کتنی تکلیف دہ حقیقتیں ہیں۔ مگر مجھے اپنے مہلک زخموں کی نمائش نہیں

کرنی چاہیئے - تم گھن کھا جاؤ گی - اور یہ سوسائٹی - اُس نے بلند قہقہہ لگایا - میرے قابلِ نفرت وجود سے گھبرا اٹھے گی ــــ ہاں تو میں کہہ رہا تھا - یہ ماحول صرف رشیدہ کو جنم دے سکتا ہے - تمھیں نہیں ــــ ے کوارٹروں کے ان کوارٹروں میں اٹیلا پیدا نہیں ہو سکتی - اُس کی آواز میں ہمک تھی - تم میرے جذبۂ خلوص کے ہر احترام کی مستحق ہو - آج کے بعد - جب تنہائیاں تجھے ڈسیں گی - اور جھینگروں کے ساز بے دردآلود فضاؤں میں وحشت ناک نغمہ بکھیریں گے اُس وقت میں تمھیں آواز دوں گا -

اٹیلا کو محسوس ہوا جیسے اسلم ایک روشنی ہے - ایک چراغ ہے - ایک ستارہ ہے - جواب اُس کے ذہن کے افق پر چمکتا رہے گا - جو اُسے اندھیروں سے نکلنے کی دعوت دے رہا ہے - جو اُسے جھینگروں کے ساز بے چھیڑتے ہی پورے خلوص سے آواز دے گا -

اٹیلا کی آواز میں درد جاگ اٹھا - تم میرے ذہن کی روشنی بنتے جا رہے ہو ــــ چند لمحوں کے لیئے ہی سہی - لیکن اعتماد کا جو درس تم مجھے دے رہے ہو - وہ میرے لئے بہت کافی ہے - میں نے زندگی کی بازی ہار دی تھی - میں بدکاری تھی - اور بدکاری عزتِ نفس سے محروم ہوتا ہے اٹیلا نے اسلم کے پریشان بالوں کو ہاتھ سے سنوارتے ہوئے کہا - تم پہلے مرد ہو جس نے میرے آوارہ وجود کی برہنہ لاش پر اپنے ترحم کا کفن ڈالا ہے

آتش دان پر رکھے ہوئے ٹائم پیس نے پانچ بجا دیئے - سورج

ترچھا ہو کر مغرب کی وسعتوں میں روپوش ہوتا جا رہا تھا۔
اور سمندری ہواؤں میں خوش گوار خنکی آ چلی تھی۔

روشن دن بھر بیڑیاں بنانے کے بعد ابھی ابھی ستانے کے لئے بان کی چارپائی پر لیٹی تھی۔ اُس کی ماں کہیں پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ دہلی والی لڑاکا خالہ کے یہاں، یا خارش زدہ ٹیلر ماسٹر کے گھر جو اپنے بن بُلائے مہمانوں کی مدارات کے لئے اسلم سے قرض لے کر ایک گونا اطمینان محسوس کر رہا تھا۔

دو روپے جو دن بھر بیڑیاں بنانے کے بعد مزدوری کی صورت میں اُسے ملے تھے۔ وہ اُس کے دوپٹے کے آنچل میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ بے سُدھ سی چارپائی پر پڑی ہوئی اپنے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں کا شور سُن رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے دل کی دھڑکنوں کا یہ شور۔ ہر لمحہ۔ ہر آن۔ بڑھتا جائے گا۔ بڑھتا جائے گا۔ یہاں تک کہ کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ اور

اس کا دل خون ہو کر بہہ جائے گا ۔۔۔

روشن کا جسم گرم ہو رہا تھا۔ سلونا چہرہ اُتر کر اور بھی زیادہ دل کش ہو گیا تھا۔ دن بھر کی مشقت نے اس کا جوڑ جوڑ ہلا دیا تھا۔ بیڑی کے پتہ میں تمباکو بھرتے بھرتے اس کے ہاتھ درد کرنے لگے تھے۔

وہ بان کی چارپائی پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ کرتے کی آستینیں کاندھے تک چڑھ آئی تھیں اور اس کی بانہیں کسی درخت کی کٹی ہوئی شاخ کی طرح کانپ رہی تھیں۔ جو زمین پر ہوا کے جھونکے سے ہل اٹھتی ہے اور تمام رات اوس میں بھیگتی رہتی ہے۔ اس کے شانوں کے درمیان کا گوشت ابھرا ہوا تھا۔ جس میں سانس کے ساتھ لرزش پیدا ہو رہی تھی۔

کوارٹر کا کمرہ عجیب و غریب چیزوں سے اٹا ہوا تھا۔ بے شمار چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ سوکھے ہوئے جوتے۔ بوسیدہ کپڑے۔ ٹین کے ڈبے۔ چھوٹی بڑی بوتلیں۔ اور پلنگ کے نیچے ٹین کا بدنما صندوق جس پر سیاہ رنگ کی بلی نہ جانے کب سے سو رہی تھی۔

ایک طرف چھوٹے سے لکڑی کے تختہ پر ٹوٹا ہوا کنگھا، سرسوں کے تیل کی شیشی۔ اور بالوں کے چند کلپ رکھے تھے۔ اس کے پاس ہی دیوارگیری پر لٹھے کی شلوار لٹک رہی تھی۔

چارپائی کے پاس۔ اگلے وقتوں کی لوہے کی زنگ خوردہ کرسی پڑی تھی۔ جس کی پشت کا ایک حصہ غائب ہو چکا تھا۔ اس کرسی کے عین اوپر دیوار پر قائداعظم اور لیاقت علی خاں مرحوم کی تصویریں کسی اخبار

سے کاٹ کر چپکائی گئی تھیں۔ اور جو اب اپنی آب و تاب کھو کر چغتائی آرٹ کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔

جب روشن بڑیاں بناتے بناتے تھک جایا کرتی تھی تو اسی طرح بے سُدھ ہو کر بان کی چارپائی پر پڑ جایا کرتی تھی۔ وہ پہر دن اپنے کمرے میں خاموش پڑی رہتی۔

اب کچھ دنوں سے وہ چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی اسی کمرے میں چُھپ کر گذار دے۔ اُسے ڈھونڈنے والا تھا بھی کون؟ لے دے کے ایک بوڑھی ماں تھی۔ اور ماں سے جذباتی رشتوں کی تکمیل اس انداز میں تو ہو نہیں سکتی۔ وہ چارپائی پر لیٹی ہوئی احساس کے اندھیرے اُجالوں میں بھٹک رہی تھی۔ یہ آنکھ مچولی بھی خوب تھی۔ کبھی نااُمیدی کے اندھیرے میں اس کا وجود غائب ہو جاتا تھا اور کبھی اُجالے کی کسی تابندہ کرن میں۔ اُس کا انگ انگ جھلملانے لگتا تھا۔۔۔

یہ زندگی جو وہ کچھ دنوں سے گذار رہی تھی۔ اُس کے لیے بالکل نئی تھی۔ اسلم کا تصور، اب اُس کے لیے ایک اذیت ناک سزا تھا وہ رشیدہ کا ہو چکا تھا۔ ایک دوسری لڑکی کا۔ جو اُس سے بہنوں جیسا پیار کرتی تھی۔ جو اُس کی طرح غریب تھی۔ جو اُس کی طرح اسلم کو دیوانہ وار چاہتی تھی۔ اُسے اس مرحلہ پر رشیدہ سے شدید ہمدردی ہو جایا کرتی تھی۔ اُس کی اپنی پیاس اس موقعہ پر ختم ہو جاتی تھی۔

ٹین کے صندوق پر سوئی ہوئی بلّی نے اچانک اپنی آنکھیں کھول

دیں اور جب اُس نے اپنی چاروں ٹانگوں کو سمیٹ کر زوردار انگڑائی لی تو پاس رکھی ہوئی بڑی بوتل گر گئی۔ روشن نے چارپائی کے نیچے جھانک کر بلی کو دیکھا اور پھر اپنی آستینوں کو درست کرکے آنکھیں بند کرلیں۔

اُس نے پڑے ہی پڑے سوچا۔ محبت کے معاملے میں وہ کتنی بدنصیب ہے۔ اسلم یہ بھی نہیں جان سکا کہ وہ اُس سے پیار کرتی ہے اُس کے اندر ہی اندر ایک آگ سُلگ رہی ہے۔ اور ایک زہریلا دھواں۔ دھیرے دھیرے اُس کا دم گھونٹ رہا ہے۔ اور ایک دن۔ ہاں۔ ایک دن۔ زہریلے دھوئیں کے اثر سے اُس کا سانس رُک جائے گا۔ اور کوئی یہ بھی نہیں، جان سکے گا کہ روشن کی جوانی اتنی جلدی قبر کی تاریکیوں میں کیوں دفن ہوگئی۔ رشیدہ بھی نہیں جان سکے گی۔ اور اسلم بھی نہیں۔ جس کا تصور اب اُس کے لئے ایک اذیت ناک ہوتا جارہا ہے۔

تکلیف دہ جذبات روشن کے سانسوں میں رچے ہوئے تھے.. پیر کے انگوٹھے سے گرم لہر اُٹھکر اُسے دماغ سے ٹکراتی ہوئی معلوم ہوئی جس میں اُس کا سارا وجود پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس کے دل کا ہر جذبہ شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ یہ آگ میرے سارے مساموں میں رچ جائے گی۔ اُس کا دل پہلے سے بھی زیادہ دھڑکنے لگا۔ وہ حالات کے خلاؤں میں قلابازیاں کھا رہی تھی۔ اور ان خلاؤں میں شعلے تھے۔ دائیں۔ بائیں۔ اوپر۔ نیچے لپکتے ہوئے نامرادیوں کے شعلے ہی شعلے تھے۔ اُس کی

پلکیں بھیگ گئیں۔ آنسو اُسے سکون پہنچا رہے تھے۔ آنسو بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھا رہے تھے۔

روشن کی ماں ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اب سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور دیواروں پر لگی ہوئی تصویریں۔ رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں روپوش ہوتی جا رہی تھیں۔ روشن اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے ہاتھ سے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو درست کیا۔ اور دیوارگیری پر رکھی ہوئی لالٹین کو جلا دیا۔ روشنی میں بھی اُسے ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔

وہ اپنی تھوڑی کو ہاتھ کی ہتھیلیوں پر رکھے سوچ رہی تھی ــــ میں بابو کو نہیں پا سکتی۔ میری برادری۔ میرا گھر۔ میری ماں۔ اور یہ حالات پھر رشیدہ ــ جو اُس سے سبقت لے جا چکی تھی۔

جس نے اپنے خاموش کردار سے اسلم پر اپنے پیار کو ظاہر کر دیا تھا۔ اس لئے ناکامیاں تو اُس کا مقدر تھیں۔ پھر وہ۔ صرف ایک مرتبہ تو اسلم کو بتا دے کہ اُس کے چاروں طرف جو اندھیرے ہیں۔ تاریکیاں ہیں وہ اُس کے اپنے جذبات کی پیداوار ہیں۔ وہ ان اندھیروں میں ساری عمر بھٹکتی رہے گی۔ اور اسے اس کا غم بھی نہیں ہے۔ لیکن کسی دوسرے کو اس کا احساس تو ہو جائے کہ ایک بدنصیب لڑکی۔ اُس کے پیار کی جوت لئے ہیکراں اندھیروں میں گھٹ گھٹ کر مر جانے کا عزم کر چکی ہے ــ ممکن ہے اس طرح اُس کے دل کو سکون آ جائے۔ پھر وہ خود بھی مزے لے لے کر غم کی اس چتا میں جلے گی۔

اُسے کسی کے چلنے کی آہٹ سُنائی دی۔ پاؤں کی چاپ اُس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ کمرے میں بیٹھے بیٹھے بولی — ماں اتنی دیر کہاں لگا دی تھی۔ لیکن آنے والے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور معًا جب اُس کی نظریں اُٹھیں تو اُس کے سامنے رشیدہ کھڑی تھی پیالنس لیتی ہوئی چاندنی — وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ ارے تم — دل کا چور نگاہوں سے جھانکنے لگا۔

رشیدہ کی آواز سُنائی دی۔ کمرے میں گھٹی ہوئی کیا کر رہی تھیں۔

روشن افسردہ لہجہ میں بولی۔ تھک گئی تھی۔ چارپائی پر لیٹی تو آنکھ لگ گئی۔ آؤ بیٹھو نا۔

وہ دونوں بیٹھ گئیں — روشن کا چہرہ ابھی تک اُترا ہوا تھا۔ اور رشیدہ شاید اُس کی پریشانی کو محسوس کر چکی تھی۔

چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے۔ رشیدہ نے ہمدردی سے کہا

کوئی بات نہیں۔

بات تو ضرور ہے جسے تم چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔

وہ کیا کہے۔ کس طرح کہے۔ بات بھی تو ایسی ہے۔ روشن ذہنی اُلجھن کا شکار ہونے لگی۔ اگر وہ بتا دے کہ اُسے بابو سے پیار ہے۔ بابو اُس کی ذہنی پریشانی کا باعث ہے تو رشیدہ کے دل پر کیا گذرے گی۔

اس کا انگ انگ کانپ اٹھا۔ وہ ذلیل ہو جائے گی۔ رشیدہ اُس سے نفرت کرنے لگے گی۔

رشیدہ نے اس کی پیشانی چھوتے ہوئے کہا۔ تمھارا تو جسم بھی گرم ہو رہا ہے۔ پھر وہ گہری ہمدردی کے جذبات کے تحت بولی۔ کیا بات ہے۔ بتا دو نا۔؟

روشن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کس طرح بتا دوں۔ کوئی بات بھی تو نہیں۔ وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔

مجھے اسی طرح پڑا رہنے دو۔ میں بہت بری ہوں۔ میری قسمت ۔۔۔ اُس کی آواز رندھیا گئی۔

رشیدہ نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ عورت عورت کے غم کو زیادہ سمجھتی ہے۔ تاثرات کے انھیں راستوں پر وہ اپنی جیتی ہوئی بازی بھی خوشی خوشی ہار جاتی ہے۔

مجھے اپنا سمجھو روشن۔ رشیدہ کی آواز میں اپنائیت تھی۔

روشن رو رہی تھی۔ تم میری ہو۔ اور میرا ہے بھی کون۔؟

رشیدہ مصر تھی۔ تو پھر بتا دو نا کیا بات ہے۔ ممکن ہے میں کام آ سکوں۔

روشن نے تڑپ کر رشیدہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایسا نہ کہو۔ میں اتنی بری نہیں ہوں۔

اوہ۔ رشیدہ جیسے سب کچھ سمجھ گئی۔ یہ بات ہے۔ وہ اب مسکرا رہی تھی۔ کسی سے پیار ہو گیا ہے۔

بس یہی سمجھ لو۔ روشن معصومیت سے بولی۔

کون ہے وہ ؟

تمھارا پاگل' روشن لجا کر بولی

وہ گارڈ صاحب ؟

اب میں کچھ نہیں کہوں گی - وہ دُہری ہو گئی

لیکن میں تو ابھی تک انجان ہوں -

کہہ جو دیا تمھارا پاگل' روشن تھکی تھکی آواز میں بولی - اور اس سے زیادہ میں نہیں بتاؤں گی -

سچ کہتی ہو ؟ رشیدہ حیران تھی -

ہاں - بالکل سچ - مجھے پاگل سے محبت ہو گئی ہے - محبت بھی تو پاگل پن ہے - تمھیں تو کہہ رہی تھیں - اس پاگل پن کی کوئی حد نہیں ہوتی -

تم مجھے ٹال رہی ہو - رشیدہ رنجیدہ ہو گئی -

تم تو یوں ہی بد گمان ہو رہی ہو - اب روشن نے خود کو سنبھال لیا تھا - دل میں اٹھتا ہوا طوفان، آنسو بن کر بہہ چکا تھا - اور اب وہ تلخ تاثرات کے نقوش اپنے چہرے سے مٹا چکی تھی -

آج صبح سے میری طبیعت خراب تھی - روشن نے بات ٹالنا چاہی

اور وہ تمھارے بابو کہاں ہیں ؟

رشیدہ چارپائی سے اٹھکر لوہے کی کرسی پر بیٹھ گئی - نہیں بتاتے وہ شوخی سے بولی -

اپنی شادی کی مٹھائی کب کھلاؤ گی - روشن کے لہجہ میں عجیب سی یاس تھی -

چینی پر سخت کنٹرول ہے - پھر وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی - تم مجھ سے باتیں چھپاتی ہو اب میں بھی تمھیں کچھ نہیں بتاؤں گی -

روشن کو محسوس ہو رہا تھا - جیسے وہ رشیدہ کے سامنے ننگی ہوتی ہوتی بچ گئی ہے - لیکن اس کی روح پر جو حجاب طاری ہو چکا تھا - وہ بدستور اُسے منفعل کئے تھا -

رشیدہ نے تھوڑی دیر بعد کہا - روشن ہمیں ایک دوسرے سے کچھ بھی نہیں چھپانا چاہئیے - سمجھ رہی ہو نا میری بات - ممکن ہے - ہم ایک دوسرے کے غم میں شریک ہو سکیں - تم کمرے میں تنہا پڑی ہوئی رو رہی تھیں - تمھاری بھیگی ہوئی پلکیں - پریشان بال - اُترا ہوا چہرہ - اور افسردہ آنکھوں سے جھانکتا ہوا دل کا چور - تم ان حقیقتوں سے انکار نہیں کر سکتیں تم کچھ بتانا نہیں چاہتیں - خیر - یہ اپنا اپنا معاملہ ہے -

روشن نے درمیان میں بات کاٹنی چاہی -

ہاں - ہاں یہ اپنا اپنا معاملہ ہے - رشیدہ نے مکرر کہا - تمھارے دل کی پرشور دھڑکنیں میں زیادہ قریب سے سُن سکتی تھی -

روشن زچ ہو کر بولی - تم تو تقریر کرنے لگیں -

معاً قدموں کی اُبھرتی ہوئی چاپ پھر سُنائی دی، اور دوسرے ہی لمحہ پاگل کا چہرہ اُن کے سامنے تھا - گاڈاب گلی کے تمام لوگوں سے

واقف ہو چکا تھا اور روشن کی ماں جبین سے تو اُس کی خوب گُھٹتی تھی پاگل نے ان دونوں کو دیکھ کر ہانک لگائی - بھیڑیں نا سمجھی کے غاروں میں اسیر ہیں - وہ میری مشیت سمجھتی ہی نہیں - پھولوں کے ساتھ کانٹوں کی باڑ کھانا کہاں کی عقلمندی ہے -

وہ دونوں ہنسنے لگیں

پاگل ننگے فرش پر بیٹھ گیا - جب میں نے بھیڑوں سے کہا روؤ تو وہ ہنسنے لگیں - اور جب میں نے انھیں حکم دیا ہنسو، تو اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں -

گاڈ صاحب! رشیدہ شرارت پر تُلی ہوئی تھی - یہ روشن بھی کسی سے پیار کرتی ہے -

روشن کا چہرہ لال ہو گیا - یہ بات نہیں گاڈ صاحب -

گاڈ صاحب موڈ میں تھے - کوئی جیتی ہوئی بازی ہار جاتا ہے - اور کوئی ہار کر بھی جیت جاتا ہے - بنی عامرہ کے لوگوں نے میری نافرمانی کی تھی روشن کی - وج نے ایک نئی بات محسوس کی - کوئی ہار کر بھی جیت جاتا ہے - وہ پھر جذباتی ہونے لگی - تو کیا میرے چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے مٹ جائیں گے - اور وہ سامنے والا بابو ایک کرن بن کر میرے راستوں میں روشنی بکھیر دے گا -

رشیدہ کچھ بھی نہیں سمجھی - اسے دعا دو گاڈ صاحب - یہ آج بہت پریشان ہے -

گاڈ صاحب فرش پر اوندھے لیٹ گئے۔ اے بنی عامرہ کے لوگو! انتظار دیکھو۔ میں نے تقدیریں بدل دی ہیں۔

روشن کی ماں نہ معلوم کب کی آچکی تھی۔ اور اب وہ چولھے کے پاس بیٹھی ہوئی چائے کے پانی کو کھولا رہی تھی۔

رشیدہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ شاید ابّا آجائیں تم آؤ گی نا۔ اس نے روشن سے دریافت کیا۔

بیٹی۔ روشن کی ماں اپنی کھوکھلی آواز میں چولھے کے پاس سے چلائی۔ چائے پی کر جانا۔

تھوڑی دیر بعد چائے آگئی اور وہ تینوں چائے پینے لگے۔ روشن کی ماں گاڈ صاحب کے پاس بیٹھی تھی۔ اعتقاد کے بے نام چکر نے اُسے پاگل کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔

گاڈ صاحب روشن کے لئے بھی دعا کرو۔ کوئی اچھا رشتہ مل جائے اس کی ماں کہہ رہی تھی۔ تم بڑے پہنچے ہوئے انسان ہو۔ تمھارا صرف اشارہ کافی ہوگا۔

پاگل گرجا ـــــ ہمارے فیصلوں پر تجھے کیا اعتراض ہے۔ اے بڈھی عورت تو میری مصلحتیں نہیں سمجھ سکتی۔ انسان میرے خلاف کتنی بھی سازشیں کرے۔ لیکن میں اپنی نافرمان اولاد کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں فاران کی پہاڑیوں پر آسمانی شہنائیاں میرے حکم کی منتظر ہیں۔ نغموں کا افسوں بکھرنے والا ہے۔

رشیدہ چائے پی چکی تھی - اور پاگل تقریر کر رہا تھا - روشن آج معلوم کیوں بڑے غور سے اُس کی باتیں سن رہی تھی - پھر وہ دونوں ماں بیٹیوں سے اجازت لے کر اپنے کوارٹر میں آگئے - پاگل بھی اُسی کے ساتھ آگیا۔

اب پھر وہ تنہا تھی - اُس کی ماں گھر کے کام میں مصروف ہو چکی تھی - آج کا دن بھی کتنا عجیب ہے - پاگل کیا کہہ گیا - اس کے دماغ پر ابھی تک کہے ہوئے الفاظ ہتھوڑا بن کر برس رہے تھے - کوئی ہاری ہوئی بازی بھی جیت جاتا ہے — فاران کی پہاڑیوں پر آسمانی تنہائیاں میرے حکم کی منتظر ہیں - وہ ان جملوں کا مطلب تھوڑا بہت جانتی تھی - جب پاگل تقریر کر رہا تھا - اس وقت اُس کی باتوں میں کتنا جلال تھا - سرزنش تھی - حکم تھا - کیا واقعی یہ انسان سب کچھ کر سکتا ہے -

پھر اُس پر ایک تھکن سی طاری ہونے لگی - اس کا بند بند ڈھیلا ہوتا جا رہا تھا - ذہنی ناآسودگی کی طغیانی اسے ہچکولے دے رہی تھی - اُسے اپنے مساموں سے شرارے نکلتے ہوئے محسوس ہوئے - اُس نے سوچا - وہ آج ساری رات روتی رہے گی - اور اس طرح بے بسی کی شدت کم ہو جائے گی۔

اُس کے احساس نے پھر ایک کروٹ لی - یہ بوجھ - یہ غبار - یہ خلش اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک اس کا علاج نہ دریافت کر لیا جائے - اور اس کا علاج یہی ہو سکتا ہے وہ بابو کو سب کچھ بتا دے - پھر اُس سے التجا کرے وہ اُسے ٹھکرا دے - گالیاں دے - اُس کا منہ نوچ لے - ہر وہ سزا دے جو سخت

سے بخت ہوتا کہ پھر اس کی زخمی محبت اپنی رسوائی کے خوف سے فریاد بھی نہ کر سکے۔

اُس نے جیسے فیصلہ کر لیا۔ وہ اسلم سے کہے گی وہ اُسے دھتکار دے۔ اُس کے جسم پر جما کے لاتیں رسید کرے۔ دل کے اس حصّہ کو مجروح کر دے جہاں ایک درد۔ ایک کرک۔ اور ایک اضطراب چھپا رہتا ہے۔ وہ تنہائی میں سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ یہاں تک کہ کافی رات گذر گئی۔ اور ستاروں کے جھرمٹ میں چاند آسمان پر نکل آیا۔ صحن میں اُس کی بڑھیا ماں بڑبڑا رہی تھی۔

احساس کے شدید ردِ عمل سے اُس کی آواز کانپ رہی تھی —
ماں چراغ بجھا دے۔ روشنی مجھے تکلیف دے رہی ہے۔

ماں حیران ہو کر بولی۔ تو پاگل ہو گئی ہے گھپ اندھیرے میں تیرا جی نہیں ڈرے گا

ٹوٹے ہوئے گلاس اور اسکاچ کی خالی بوتلیں قالین پر بکھری ہوئی تھیں۔ سگریٹ کے دھوئیں سے کمرے کی فضا میں ایک کسیلی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ٹیبل کھانے کے کمرے میں بلند آواز سے ہدایات دے رہی تھی۔ کزمل ترکی گیت گنگنا رہا تھا۔ عائشہ سرسوں کے پھول کی طرح صوفے پر نیم دراز تھی، حق نواز جولینا کو کاٹن ایکسچینج کے نرخ سمجھا رہا تھا۔ اور حیدرآبادی بیگم چارمینار کی طرح بنی ہوئی کرسی پر دراز تھیں۔ اسلم اٹیلا کے شانوں پر سر رکھے سیٹی بجا رہا تھا۔ اور نی گل آفریدی آخری گلاس توڑنے کے بعد کسی ثابت گلاس کی فکر میں چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

آٹھ بجنے میں ابھی دیر تھی۔ رکھانے پر مدعو کچھ اور مہمان بھی آگئے تھے۔ جو آپس میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سیاسی باتیں، رومانی

باتیں ۔ فقرے ۔ چلتے ہوئے جملے اور پھر بلند قہقہے ۔ کھنچی کھنچی ہنسی کا شور ۔

وہ زیادہ پینے کے بعد اپنے موڈ کا توازن قائم نہیں رکھ سکے تھے ۔ انتہائی بادہ نواری کا نتیجہ عموماً اسی قسم کی کسلمندی پر مبنی ہوا کرتا ہے ۔ ایک تھکن ۔ جو رگوں کے ایک ایک تار کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے وہ سب تھکے تھکے جسموں کے ساتھ اپنی اپنی نشستوں پر دھنسے ہوئے تھے

ٹیل بیروں کو ہدایات دے کر واپس آچکی تھی ۔ اور اب وہ سب کو کھانے کی میز پر مدعو کر رہی تھی ۔ کرنل کھانے سے قطعی انکار کر رہا تھا حالانکہ وہ صبح سے بھوکا تھا ۔ مگر اب نشہ کی زیادتی نے اُسے بالکل بیکار انسان بنا دیا تھا ۔

اٹیلا نے اسلم کو ہوشیار کیا ۔ عائشہ لڑکھڑاتی ہوئی صوفہ پکڑ کر کھڑی ہو گئی ۔ اور حق نواز جولینا کو سہارا دیئے کمرے کے وسط تک جا چکا تھا ۔ بیگم فصاحت یار جنگ گل آفریدی کے گلے میں باہیں ڈالے کھانے کی میز کی طرف جا رہی تھیں ۔

ٹیل نے کرنل کو بروقت ہوشیار کیا ۔ اُس نے آنکھیں کھال کر سب کو دیکھا اور پھر ہنستے ہوئے کہا ۔ میں اناطولیہ کی خندقیں عبور کرتے ہوئے گر پڑا تھا ۔

اسلم کی زبان لڑکھڑا رہی تھی ۔ بالکل غلط تم اب تک اس خندق میں پڑے ہو ۔ ایک تاریک نہاں خانے میں ۔ کرنل ٹیل کا سہارا لے کر

کھڑا ہو گیا۔ زندہ باد ٹیل۔ خدا کی قسم۔ ٹیل بہترین عورت ہے۔ وہ جھومتے ہوئے بولا۔ اس کا کردار فطرت سے بہت قریب ہے۔ پھر اُس نے ٹیل کے چہرے کو اپنی انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔ یہ چہرہ سیب کو دانتوں سے کاٹ کر کھاتے ہوئے بچے کی مانند معصوم ہے۔

ٹیل کرنل کی زبانی اپنی تعریف سُن کر تازگی، تنومندی اور حسن کا نمونہ بن گئی۔ مرد جب عورت کی تعریف کرتا ہے تو سوئی ہوئی نسائیت ایک دم جاگ اُٹھتی ہے۔ ٹیل واقعی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

کرنل کہہ رہا تھا۔ آدابِ مجلس کی پروا کئے بغیر وہ اپنے دل کی بات کہہ سکتی ہے۔ میں شادی کے بعد اُسے اغوا کر کے بہت دور لے جاؤں گا بہت دور — ساحل باسفورس کے دامن میں آباد ہونے والی کسی بستی میں۔

اسلم کو کرنل سے اتفاق نہیں تھا۔ عورت کی مناسبت کی گہرائی کو سمجھے بغیر۔ اُسے طبقاتی شعور کی لاٹھی سے ہانک دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا اٹیلا۔ وہ اٹیلا سے پوچھ بیٹھا۔ ایک دوسرے کے احترام میں، ٹھیک تو ہے۔ کتنے روحانی محسوسات ملتے ہیں۔

اٹیلا نے تائید میں سر ہلایا۔ اور حق لواز نے زچ ہو کر اپنے متک پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ جب وہ زچ ہو جاتا تھا تو بے اختیار اُسے اپنا متک یاد آ جاتا تھا۔

ٹیل انھیں کسی نہ کسی طرح کھانے کی میز تک لے آئی۔ وہ سب کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ اور پھر چھری اور کانٹے کھنکنے لگے۔ رکابیاں نج اٹھیں اور بیرے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔

نئے آئے ہوئے لوگ اُن کی باتوں کو دلچسپی سے سُن رہے تھے۔ کھانے سے کہیں زیادہ وہ ان کی باتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔

بی گل آفریدی نے کرنل سے پوچھا۔ آپ شادی سے پہلے ہی ٹیل کو اغوا کیوں نہیں کر لیتے۔؟

ٹیل مصنوعی حیا سے مسکرانے لگی

کرنل کی زبان میں لکنت تھی۔ وہ ایک عام بات ہوگی۔ کم ازکم ترک اخلاقی مجرم بننا پسند نہیں کرتے۔ عائشہ پلیٹ پر جھکی ہوئی تھی۔

بیگم فصاحت یار جنگ آلو کا قتلا منہ میں رکھتے ہوئے بولیں۔۔۔ کرنل قصار بایزید نے ایک مسرت انگیز بات کہی ہے۔ ٹیل بھی اس فیصلہ پر خوش ہوگی۔

ٹیل مصنوعی حیا کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ڈارلنگ تم بہت کم کھا رہے ہو۔ حالانکہ کرنل کھانے کے معاملہ میں کسی سے کم نہ تھا۔ اسلم کے لہجے میں طنز پیدا ہوگیا۔ سماج کے آئینہ میں اپنی ننگی تصویر دیکھکر انسان جھلا اٹھتا ہے۔ شائستگی کا ردعمل یقینی طور پر ناشائستگی ہوا کرتا ہے۔ انسان پہلے عریانی کو پسند کرتا تھا۔ جب اس سے گھبرایا

تو اُس نے کپڑے پہننا شروع کر دیئے ۔اُف ۔ میری باتوں میں کس قدر اُلجھاؤ ہے ۔ میں نرا بکواسی آدمی بن گیا ہوں ۔ ۔ ۔

ٹیل نے اسلم کی پلیٹ میں تلے ہوئے گوشت کے پارچے رکھدیئے

شکریہ ۔ شکریہ ۔ وہ انتہائی سرور کے عالم میں بول رہا تھا ۔۔ گناہ کرنے کی جب انسان میں طاقت نہیں رہتی ۔ تو وہ بے نام تقدس کے آغوش میں چلا جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب کرنل ہی کو دیکھو نا ۔ یہ زندگی کے تاریک نہاں خانوں میں لاشوں کا طواف کرتا رہا ۔ اور اب یہ احتجاجاً اپنی فطرت کے خلاف قدم اُٹھانا چاہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شادی اُس نے زوردار قہقہہ لگایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تھکے ہوئے دماغ کی اضطرابی خواہش ۔

اٹیلا نے حیرت سے اُسے دیکھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کرنل کھسیانہ ہو کر جلد جلد کھانے میں مشغول ہو گیا ۔

میں ٹھیک تو کہتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شراب مجھ پر اثر نہیں کر سکی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بے ربط طریقہ پر اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہا تھا ۔ اٹیلا میری باتوں پر حیران ہے ۔ عائشہ زیرِ لب مسکرا رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور بی گل آفریدی ۔ ۔ ۔ ۔ غریب حق نواز کے کان میں میری ذات پر تنقید کر رہی ہے ۔ ٹھیک ہے ۔ میں یہاں اجنبی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری سوسائٹی ۔ ۔ ۔ میرا ماحول تم سب سے علیحدہ ہے ۔ ۔ میری فکر و نظر کے زاویئے بھی تم سب سے مختلف ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم سڑک کے کنارے مرے ہوئے آدمی کو پڑا دیکھکر بھی مسکرا سکتے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن مسخ شدہ

کرداروں میں رہتے رہتے ..... میری روح سُلگ اُٹھی ہے ......
اور میں .... ایک آنسو ...... ایک احتجاج ... اور ایک آہ
ہو کر رہ گیا ہوں .....

قدرے توقف کے بعد وہ پھر بولا .. .... بات شادی کی ہو رہی تھی ...... آج سے پہلے ..... اگر کرنل شادی کی خواہش کا اظہار کرتا تو یہ ایک سچائی ہوتی .... یہ زندگی کا وہ محرک جذبہ ہوتا جو اُسے بلندیوں کی طرف لے جاتا ...... مجھے دیکھو نا ...... اس تضاد پر تو غور کرو .... اُس نے اپنی پھولی ہوئی سانس کو دُرست کیا۔ جوانی کی منزلوں سے گذر جانے کے بعد بھی۔ کرنل ایک خوش رو خاتون کو شادی کا پیغام دے سکتا ہے ..... وہ اس سلسلہ میں جواز بھی تراش سکتا ہے ...... سیال اندھیرے میرا تعاقب کرتے ہیں .... وہ بڑے زور سے ہنسا ...... مجھے اب ایک سہارے کی ضرورت ہے .... میری روح تنہائی کے خاردار بستروں پر سوتے سوتے تھک چکی ہے ...... یہ مفروضہ خوب ہے .... تھکے ہوئے ذہن کا ہرا ستدلال ... معلوم ہوتا ہے تنہائیوں کے ہسپتال سے بھاگا ہوا مریض ہے ....

نیل اب واقعی شرمندگی کے عالم میں بیٹھی ہوئی اُس کی باتیں سُن رہی تھی۔

خیر مجھے اس سے کیا۔ اُس نے اٹیلا کے شانوں پر ہاتھ مارتے

ہوئے کہا۔ بات تو یہ ہے..... سماج کے اس تضاد کو کیا کہا جا سکتا ہے...... شادی ایک سچائی ہے۔ لیکن اس سچائی کو ہیں۔ اور مجھ جیسے ہزاروں جوان نہیں اپنا سکتے....... ذہن کی صحت مندی ایسے نوجوانوں کو تباہ کئے ہے۔ مثال کے طور پر...... یہ کوئی ذہنی مغالطہ نہیں ہے.. مجھے اٹیلا بہت پسند ہے...

اٹیلا کا چہرہ سرخ ہو گیا...

ہاں..... ہاں.... شراب مجھے سچ بولنے کی تلقین کر رہی ہے.... مجھے اٹیلا بہت پسند ہے۔ میں نے اگر اس مظلوم عورت سے محبت کی تو..... میرے ایک عشق کا ایک معیار ہو گا..... جس کو عنبس روگی سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہو گا..... میں اسے چاہوں گا اور دل کی گہرائیوں کے ساتھ..... اور یہ ایک سچائی ہو گی..... چاہے اس کی مدت انتہائی کم ہی کیوں نہ ہو..... مگر سوچو تو... کیا یہ تھوڑی مدت بھی۔ فرشتوں کی سجدہ ریزی کے لئے..... بہت نہ ہو گی...... وہ لاپروائی سے آلو کا قتلا منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔ میری باتیں... تلخ ہیں... کئی آنکھیں نا پید بھی کر رہے ہوں گے... مگر اب میں بولتا رہوں گا..... بدن کی طلب تو آج مٹی ہے... نہ کل مٹے گی..... کھانوں سے بھری پلیٹیں ذہنی سکون نہیں پہنچا سکتیں...... میں کہہ رہا تھا نا۔ میں اٹیلا کو دل کی گہرائیوں سے پیار کروں گا..... اور وہ اس لئے کہ میرا یہ عمل

خالص میری روح کی پیداوار ہو گا۔ کسی ردِ عمل کا نتیجہ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔

کھانے کی میز پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ سارے مہمان انتہائی انہماک سے اسلم کی باتیں سُن رہے تھے۔ کرنل اسلم کی صاف گوئی پر برہم سا نظر آ رہا تھا۔ اُس کے بشرے پر ناگواری کے اثرات اُبھرے ہوئے تھے۔ اور اٹیلا لاشعوری طور پر مسرور تھی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے آج اُس نے بہت کچھ گنوا کر بہت کچھ پا لیا ہے۔ وہ اسلم کی ایک ایک بات غور سے سُن رہی تھی۔ اُسے اُس کے خوبصورت ذہن اور صداقت پسندی پر پیار آ رہا تھا۔ اے کاش تنہائی ہوتی اور وہ اسلم کا منہ چوم کر اُسے ایک ننھے بچے کی طرح تھپک تھپک کر سُلا دیتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٹیل کرنل کے چہرے پر نظریں جمائے تھی۔ اُسے ڈر تھا کہیں کوئی بدمزگی نہ ہو جائے ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر اسلم جس جلے کا نہ طریقہ پر بول رہا تھا۔ وہ اُسے "قطعًا" پسند نہیں تھا ۔ ۔ ۔ ۔

کرنل نے اسلم کی بات کاٹ دی ۔ ۔ ۔ ۔ انھیں خواہشوں میں سے ایک جنسی خواہش بھی ہے۔ تم بھول رہے ہو۔ زندگی کے ایک رخ پر تنقید کوئی معنی نہیں رکھتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جنس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جنسی خواہش ۔ ۔ ۔ جہاں پر روح کی ان گنت لطافتوں اور خوبصورتیوں کو اپنا کر تہذیب تمدن، اور مذہب کے چمن زاروں میں گھومنے والا آدم گندم کی بالیوں کی طرف لپکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور حیوانی خواہشات کے وسیع دائرے کو زندگی کہہ کر اپنے قدسی مقامات تک کھو دیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

ٹھیک ہے' اسلم بدستور لاپرواہی سے بولا۔ حیوانی خواہشات کے وسیع دائرے کو زندگی کہکر اپنے قدسی مقامات کھودینے کے بعد انسان کو ماں کی کوکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم میری باتیں سمجھ رہے ہو ناکرنل۔ ابھی مجھے اتنا ہوش ہے کہ میں اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرسکوں دراصل عورت و مرد کے جنسی شعور کی ابتدا اور انتہا' ماں کی کوکھ ہوا کرتی ہے۔ کیا تمھاری شادی کا مقصد یہی کچھ ہے۔ کیا اب تک تمھاری ہر جنسی آسودگی انھیں منزلوں سے گذری ہے۔ اس کے برخلاف' میں اپنی ہونے والی بیوی کو اپنے بچّے ـــــ اپنی تخلیق کی ماں دیکھنا چاہتا ہوں ....

کرنل نے بُرا مان کر کہا۔ یہ میری انسلٹ ہے۔

تم اب تک چند مفروضوں کے سہارے نسل آدم کی انسلٹ کرتے رہے ہو۔ تمھاری پسلی سے ابھی تک ایک بھی حوا پیدا نہیں ہوسکی ہے...... عورت دوا ہے۔ مرض نہیں۔

ٹیل نے گھبرا کر دونوں سے خاموش ہوجانے کی التجا کی۔

کرنل قصار بایزید کا احساس برتری بُری طرح مجروح ہوا تھا ...... ٹیل خود بھی نفسیاتی پریشانی محسوس کررہی تھی۔ دوسرے مہمان تفریحی نقطۂ نظر سے اسلم کو داد دے رہے تھے۔ اور اٹیلا فی الواقعی اسلم سے بہت زیادہ متاثر تھی۔ یہ اُس کی ایک فتح تھی۔ آبرومندانہ فتح۔ جو اُسے ٹیل کے مقابلہ میں حاصل ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کھانا ختم ہو گیا۔ برتن بڑھا دیئے گئے اور وہ سب واپس ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ ماحول پر ابھی تک ناگواری کے اثرات طاری تھے۔ خصوصاً کرنل کی طبیعت کا تکدر ٹیل کی کوششوں کے بعد بھی دور نہیں ہو سکا تھا۔ آج اُس کے احساس برتری کو برہنہ کر کے گھسیٹا گیا تھا...... آج ایک سر پھرے نوجوان نے اُسے ایسا ڈس دیا تھا۔ جو بندوق کی گولی بن کر اس سے اس میں کئی چھید کر چکا تھا

اٹیلا مارکونی۔ اسلم کے پاس صوفے پر بیٹھی ہوئی ایک ایک کی تاثراتی کیفیت کا جائزہ لے رہی تھی اُس نے بہت کم پی تھی۔ اس لئے وہ اپنے پورے ہوش میں تھی۔ ٹیل اٹیلا کی عادتوں سے اچھی طرح باخبر تھی۔ وہ جانتی تھی۔ یہ جذباتی لڑکی کرنل کی تضحیک سے انتہائی خوش ہے۔ اسی لئے اب وہ اٹیلا کو لفٹ نہیں دے رہی تھی۔ ممکن ہے اگر وہ اٹیلا سے باتیں کرتی تو کرنل بُرا مان جاتا۔ اب یہ دو پارٹیاں تھیں جو ذہنی اعتبار سے ایک دوسرے کے مقابلے میں آئی ہوئی تھیں۔ اور اب تک اسلم کا پلّہ بہت زیادہ وزنی تھا۔

اپن ساز بجائے گا۔ حق نواز نے بیٹھے بیٹھے کہا

اور عائشہ ایک گیت سُنائے گی۔ بیگم فصاحت یار جنگ کمال تکلف سے بولیں۔

حق نواز پیانو پر آ بیٹھا عائشہ اُس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اور جب چاند آسمان پر اپنی پوری رعنائیوں سے چمک رہا تھا۔ اور ستاروں کے

کی حدیں انسانی نظروں سے ٹکرا رہی تھیں تو حق نواز پیانو پر ایک دلکش دُھن بجا رہا تھا اور اس دُھن پر عائشہ کی رس بھری آواز گیت بن کر رقص کر رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔

بہت دیر تک حق نواز پیانو کے سروں کو چھیڑتا رہا ۔ اور عائشہ گاتی رہی ۔ رسیلے گیت ۔ اُجیالے گیت ۔ کنوارے گیت ۔ کمرے کی فضا میں وہ پھول بکھیرتی رہی ۔ اور ستاروں کے جمال کی تاباں حدیں انسانی نظروں سے ٹکراتی رہیں ۔ عائشہ گاتی رہی ۔ رومانی گیت' دل کی دھڑکن بن کر چھلکتے رہے ۔ اور حق نواز پیانو بجاتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔

رات گذرنے سے پہلے اسکاچ کا آخری دور شروع ہوا ۔ گلاس پھر کھنکے ۔ کرنل کی زندہ دلی پھر عود کر آئی ۔ بی گل آفریدی اور جولیا ایک دوسرے کے گدگدیاں کرنے لگیں ۔ اور بیگم فصاحت یار جنگ' پھر کبھو نظام حیدر آباد پر لعنتیں بھیجنے لگیں ۔

معًا عائشہ کے گیتوں نے دم توڑ دیا ۔ حق نواز کی انگلیاں پیانو پر جم کے رہ گئیں ۔ اور ستاروں کے جمال کی حدیں سمٹ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں ۔

اسلم بلند آواز سے چلایا ۔ بس اب بس کرو ۔

حق نواز اور عائشہ واپس اپنی نشست پر بیٹھ گئے ۔ ۔ ۔

اٹیلا نے پہلو بدل کر اسلم کو دیکھا جو آتش دان پر رکھی ہوئی صلیب کو گھور رہا تھا ۔

ٹیل نے کرنل کے کان میں کچھ کہا اور پھر وہ ہنستے ہوئے دُہری ہو گئی

....

اسلم کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ اب رات کافی گذر چکی ہے۔ غریب نواز۔ پیانو بجاتے بجاتے تھک چکا تھا اور عائشہ کی آواز بے ہنگم ہوتی جا رہی تھی ....

حق نواز کے مستک میں یہ بات آ گئی۔ بالکل ٹھیک ہے۔

ٹیل پھر بے چین دکھائی دے رہی تھی اور کرنل بڑا سا سگار جلائے اطمینان سے پی رہا تھا۔ دھوئیں کے مرغولے کمرے کی چھت سے ٹکرا رہے تھے ....

اسلم اپنا گلاس خالی کر چکا تھا... گذرتے ہوئے لمحوں کا عظیم تسلسل ڈھلتی رات کا خوابناک حصہ بن چکا ہے۔ ہمارے اعصاب تھک چکے ہیں ... ... ۔ اُف میرا سر۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پیشانی کو چھوا۔ شراب میرے دماغ کے پردوں کو جلاتی جا رہی ہے۔ .... کہکشاں زار تجلیوں نے مجھے گھیر لیا ہے۔ رینگتے ہوئے اندھیرے دم توڑتے جا رہے ہیں۔ پھر اُس نے اسکاچ کا دوسرا پیگ بھی ایک ہی سانس میں ختم کر ڈالا۔ میں کہہ رہا تھا یہ ڈھلتی ہوئی رات کئی اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔ آج ہی کی رات ہم میں سے بعض نے سچائیوں کو پایا ہے اپنے ذہن میں انتہائی اہم فیصلے کئے ہیں۔ جو بہت جلد ظاہر ہوں گے۔

ہم حقیقتوں کا سامنا کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ اس لئے ہماری طبیعتیں

ممکن ہیں۔ مگر یہ طوفان بہت جلد گذر جائے گا۔ دلوں کی برہمی دور ہو جائے گی۔ اور اس کی جگہ خلوص کی چاندنی لے گی۔

کرنل ٹیل کی کمر میں ہاتھ ڈالے پے در پے سگار کے کش لے رہا تھا۔

اسلم کی باتوں میں خلوص تھا۔ ہمیں رنجیدہ نہیں ہونا چاہیئے — زندگی خود ایک مستقل غم ہے۔ غم کا ہولناک صحرا۔ اور یہ چمن زار اُسی وقت بن سکے گا۔ جب ہمیں زندہ رہنے کا سلیقہ آجائے گا۔...... اسلم نے ایک طویل سرد سانس لیا۔ رات گذرتی جا رہی ہے...... رات گذر ہی... جایا کرتی ہے...... یہ بیتے ہوئے خوش گوار لمحے اب کبھی واپس نہیں آئیں گے.... ہم نے اس مختصر سے کمرے میں بیٹھ کر بہت قلیل وقفے میں ایک دوسرے کو سمجھا ہے۔ ایک دوسرے پر تنقید کی ہے۔ اپنی مخلصانہ رائے کا اظہار کیا ہے....

ٹیل نے پہلی بار اسلم کو سگریٹ جلا کر دیا۔

بہت بہت شکریہ۔ کیا کرنل نے اجازت دیدی تھی۔ وہ ایک فراخ دل انسان ہے۔ میدانِ جنگ کی ہولناک ساعتوں نے اُسے زندگی کو سمجھنے کا موقعہ نہیں دیا۔ لیکن وہ اس کے باوجود مخلص انسان ہے۔ اور جب آدمی کچھ نہیں ہوتا تو وہ مخلص ہوتا ہے۔ یہی حال کرنل کا بھی ہے۔

اٹیلا نے اُسے یاد دلایا۔ تم بڑی اچھی تقریر کر رہے تھے۔ اٹیلا کے سمجھانے کا طریقہ دل کش تھا۔ وہ اعتماد انگیز لہجے میں اُسے سمجھاتی رہی۔ کاش اے۔ کاش وہ تقریر اس طرح ختم نہ ہوتی۔ اسلم نے صوفے

کی پشت سے اپنا سر لگا دیا۔ ہاں۔ہاں مجھے یاد آیا۔ میں کہہ رہا تھا۔ یہ لمحے اب کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ حالات کا اژدہا صبح ہوتے ہی ہمارے وجود کو نگل لے گا۔ پھر اس محفل کی یاد ہوگی۔ اور ہم ہوں گے۔

اسلم بہت زیادہ بہک رہا تھا۔ ہم لوگ جو خود کو ایک دوسرے کا دوست کہتے ہیں۔ سخت الو کے پٹھے ہیں۔ اگر کرنل کے ہاتھ میں ابھی ریوالور دیدو تو وہ پہلی گولی میرے سینہ میں اُتار دے۔

کرنل نے بدستور سگار پیتے ہوئے کہا۔ فی الواقعی میں ایسا ہی کروں

اسلم کھلکھلا کر ہنسا۔ تم خاص الخاص درجے کے انسان ہو۔۔۔ خیر۔ میں اتنی اونچی نسل کے انسانوں کی مزاجی کیفیت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔ وہ بے تحاشہ ہنسنے لگا۔ ہر چیز اس کے قہقہوں کی زد پر تھی۔ کمرہ۔ آدمی۔ عورتیں۔ آسمان۔ زمین۔ اُس کے بلند قہقہے سب کے دلوں پر تیر بن کر برس رہے تھے۔ وہ ہنستا رہا۔ ہنستا رہا۔ یہاں تک کہ ایک عجیب سی مدہوشی نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور اس آغوش میں نہ گرمی تھی۔ نہ سردی۔ نہ روشنی۔ نہ اندھیرا۔

صبح ہی صبح اسلم کی آنکھ کھُل گئی۔ اُس کا سر گھوم رہا تھا۔ حلق خشک تھا۔ اور سارا جسم درد کر رہا تھا۔ اُس نے نیم وا آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ انیلا قالین پر سو رہی تھی۔ اور بڑے صوفے پر کرنل اور نیل ایک دوسرے سے لپٹے پڑے تھے۔ وہ پوری طرح بیدار ہو گیا

اگرچہ ابھی تک وہ اپنے حواس پورے طور پر مجتمع نہیں کر سکا تھا۔

کمرہ سگریٹوں کے دھوئیں سے بسا ہوا تھا۔ مہمان نہ معلوم رات کب چلے گئے تھے۔ اسے محسوس ہوا جیسے رات کی سرمستیاں گذر جانے کے بعد، ہر چیز اپنے وجود پر نالاں ہے۔ اسکاچ کی خالی بوتلیں۔ ٹوٹے ہوئے گلاس۔ جنھیں ابھی تک ملازمین نے اُٹھایا بھی نہیں تھا۔

اٹیلا قالین پر سو رہی تھی۔۔ بالکل اُس کی ٹانگوں کے پاس معصومانہ نیند کے کنول اُس کی پلکوں پر سجے ہوئے تھے۔ اسلم نے ایک طویل جماہی لے کر آنکھیں کھول دیں۔

نیل صوفے پر کسمسائی۔ اور کرنل کے بھاری بھرکم وجود سے لپٹ کر پھر سو گئی۔ اُسے ایک پھریری سی آئی۔ اور اُس نے آتشدان پر رکھے ہوئے پاک مریم کے مجسمے کی طرف دیکھا جو کمرے کی ہر چیز کو گھور رہا تھا۔

اسلم لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور پاس رکھا ہوا گلاس جس میں رات کی بچی ہوئی اسکاچ تھی لے کر اٹیلا کی ٹانگوں پر گر گیا۔ اسلم نے جلدی سے گرے ہوئے گلاس کو اٹھا کر تپائی پر رکھ دیا۔ لیکن اٹیلا گلاس کے گرنے سے بیدار ہو گئی تھی۔

اسلم کو بیدار دیکھ کر اُس کا سارا وجود مسکرا پڑا۔ وہ زندگی کی قوس بن کر اُٹھ بیٹھی۔ اور مہک بن کر اُس کے نشہ آلود دماغ پر چھا گئی۔

وہ خاموشی سے اُٹھا اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گیا جہاں تازہ ہوا میں اُسے ایک فرحت محسوس ہوئی۔ اٹیلا بھی اُس کے پیچھے پیچھے

برآمدے میں آگئی۔

اسلم مضمحل ہو رہا تھا ...... میں اب جانا چاہتا ہوں ...۔

ایٹیلا کی آواز میں نیند رچی ہوئی تھی۔ وہ دونوں تو ابھی سو رہے ہیں .....

آپ بھی سو جائیں۔ آپ کے چہرے پر تھکن کے آثار باقی ہیں۔

شکریہ۔ ایٹیلا نے ملائمت سے کہا۔ اب ایسی کوئی ضرورت نہیں۔

اسلم نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔

کم از کم ناشتہ تو تیار ہو جائے۔ صبح کی چائے۔

کسی بھی ہوٹل میں پیٹ کی اس آگ کو بجھایا جا سکتا ہے۔

اور اگر کرنل نے مجھ سے باز پرس کی تو؟

اسلم طنزاً مسکرایا۔ کرنل غریب، بہت دیر تک سوئے گا۔ اور پھر آپ اسے بہتر طریقہ پر سمجھا سکتی ہیں۔

میں آپ کو صدر تک چھوڑ دوں۔ ایٹیلا مُصر ہوئی۔

چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے بس مل جائے گی۔ آپ زحمت کیوں کرتی ہیں!

ایٹیلا نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ چلیے اب ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

اسلم نے کوئی مزاحمت نہ کی ..... وہ دونوں کار تک آگئے۔

جو کوٹھی کے پورچ میں کھڑی ہوئی تھی۔ اٹیلا نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا۔ اسلم بھی اگلی نشست پر بیٹھ چکا تھا۔

خدا کرنل کا بھلا کرے آدمی خوبیوں کا ہے۔ خود سو رہا ہے لیکن اُس کی کار ہماری سروس کر رہی ہے۔

اٹیلا نے مسکرا کر گاڑی کو اسپیڈ میں ڈال دیا۔

تارکول کی سڑکیں رات بھر کی اوس میں بھیگ کر نکھری ہوئی تھیں ہنگامے ابھی پوری طرح جاگے نہیں تھے۔ زندگی ابھی اپنے اضطرابی لمحوں کو لئے سو رہی تھی۔ کار صدر کی طرف دوڑتی رہی۔ اٹیلا کی نیم عریاں بانہیں مسلسل حرکت میں تھیں۔ اسٹیرنگ ہر آن گھوم رہا تھا۔ اور اسلم کے ذہن میں گذشتہ رات کی یادیں سرسرا رہی تھیں۔

گورا قبرستان سے گذرنے کے بعد وہ جلد ہی ایمپریس مارکیٹ آ گئے۔ اٹیلا تمام راستہ خاموش رہی جذبات کی دھوپ چھاؤں کے لمحاتی افسوں نے اُسے بے خود بنا رکھا تھا۔ کاش یہ سفر کبھی ختم نہ ہوتا۔ اور کار دوڑتی رہتی۔ انجانی منزلوں کی طرف۔

اسلم چونک سا گیا۔ آخر منزل آ ہی گئی۔

اٹیلا نے کار کو بریک لگا کر روک دیا۔

میں آپ کا ممنون ہوں۔ رات لاشعوری طور پر کوئی غلطی سرزد ہوئی ہو تو معاف کرنا۔

اٹیلا کو اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اب کب ملاقات ہوگی۔؟

اسلم نے خشک ہونٹوں پر پھر زبان پھیری - معلوم نہیں ....
ممکن ہے صرف یہ یاد ہی - زندگی کا حاصل بن جائے۔

اٹیلا کی گھنیری پلکیں کانپیں - اُس نے جلدی سے کہا - کل شام کو - اسی جگہ - میں تمھارا انتظار دیکھوں گی - اُس نے جواب کی پروا کئے بغیر تیزی سے کار اسٹارٹ کردی - وہ دیکھتا رہ گیا - کار موڑ پر پہنچ کر اُس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی ..... پھر وہ بھی تھکے تھکے قدموں سے ایک طرف چل دیا —

کواٹروں کی آڑی ترچھی قطاروں کے درمیان صبح کی دھوپ پوری طرح پھیل چکی تھی۔ رشیدہ کے کواٹر کے سامنے مدراسی خاندان کے بے ہنگم بچے ایک دوسرے پر دھول پھینک رہے تھے۔ ٹیلر ماسٹر ابھی ابھی گھر سے نکل کر دوکان گیا تھا۔ مہمانوں نے اُس کی زندگی دوبھر کر دی تھی۔ تین بڑے اور سات چھوٹے مہمانوں کی غیر متوقع آمد اُس کے لئے کسی حادثے سے کم نہ تھی۔

دلّی والی خالہ کواٹروں کے نل پر کھڑی ہوئی اپنا بایاں ہاتھ نچا نچا کر باتیں ملا رہی تھی، اور روشن کی ماں جمّن۔ اپنے دروازے میں بیٹھی کھیلتے ہوئے بچوں پر تبصرہ کر رہی تھی۔ اُس کی آواز میں ناگواری تھی۔ بچوں کا وجود اُس کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ اور پھر مدراسی خاندان کے

بے ہنگم بچوں سے تو اُسے نہ معلوم کیوں جلن تھی۔ ایک خاص نوعیت کی ضد۔۔۔۔۔

رشیدہ اپنے کواٹر میں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ اور اُس کا چھوٹا بھائی۔ صحن میں بیٹھے ہوئے پاگل کو چھیڑ رہا تھا۔ اور پاگل گُم صُم بیٹھا ہوا اپنی زیر تصنیف بائبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ بچپن کی معصوم شرارتیں۔ رشیدہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کئے تھیں بھائی کی معصوم حرکتوں پر بہن مسکرا رہی تھی مشفقانہ احساس کی چڑھتی ہوئی ندی کا دوسرا کنارہ بہن کی نظروں سے ناپید تھا۔ لیکن پھر بھی وہ چھوٹے بھائی کو کئی مرتبہ فہمائش کر چکی تھی۔ اور اب بھی کہہ رہی تھی۔ مان جاؤ بھیا۔ ۔۔۔گاڈ صاحب کو غصہ آجائے گا۔۔۔۔۔

رشید رات نہیں آیا تھا۔ مہینہ میں ایسی کئی راتیں آیا کرتی تھیں۔ جب وہ شہر میں کسی سڑک کے کنارے رکشہ ہی میں پڑ کر سوجایا کرتا تھا۔ دن بھر کی تھکاوٹ کے بعد جب ہمت جواب دیدیا کرتی تھی تو وہ عموماً گھر سے باہر ہی سوجایا کرتا تھا۔

رشیدہ چولہے پر چائے کا پانی رکھکر کھڑکی کے نما روشن دان کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ مدراسی خاندان کے بے ہنگم بچے، گلی کے خارش زدہ کتے کی دم پکڑ کر گھسیٹ رہے تھے۔ اُس نے سوچا آج ناشتہ پر کوئی نہیں ہوگا۔ بھیا بھی رات سے نہیں آئے اور ـــ بابو بخدا جانے وہ کہاں ہیں۔۔۔۔۔ رات وہ بھی تو نہیں آئے۔۔۔۔

پاگل بڑی دیر سے گم صم بیٹھا تھا پھر وہ بھی اُٹھکر رشیدہ کے پہلو میں آکھڑا ہوا۔ رشیدہ نے بڑی عقیدت سے گاڈ صاحب کو مخاطب کیا۔ کیا آج کوئی نہیں آئے گا۔۔۔

گاڈ نے صبح کی پھر ہانک لگائی ۔۔۔۔۔۔ اے انتظار کے ویرانو ختم ہو جاؤ ۔ یہ گاڈ کا حکم ہے۔۔۔

پھر آخری کواٹر کے سامنے ایک سایہ لہرایا۔ اور رشیدہ نے جب غور سے دیکھا تو وہ اسلم تھا۔ جس کے ہاتھوں میں مختلف بنڈل تھے۔ اور جس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رات بھر جاگا ہے ۔۔۔۔۔۔ یا اُس نے سخت محنت کی ہے۔

اسلم کھڑکی نما روشن دان کے قریب آکر رُک گیا ۔۔۔ رشیدہ سے جب اُس کی نظریں چار ہوئیں تو ایک ساتھ ان دونوں کے دل دھڑکے اور اُسی وقت مدراسی خاندان کے سیاہ فام بچوں نے خارش زدہ کتے کو پتھر دے مارا ۔ کتا بڑی دردناک آواز میں چیخ رہا تھا۔

آجائیے نا۔ میں آپ ہی کا انتظار دیکھ رہی تھی ۔ رشیدہ کھڑکی نما روشندان سے ہٹ کر کواٹر کے صحن میں آگئی ۔۔۔ ۔۔۔

اسلم اندر آگیا ۔ پاگل نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر اُس کا استقبال کیا۔ اُس نے سامان کے بنڈل رشیدہ کو تھما دیئے۔

رشیدہ بہت خوش تھی۔ اتنا سامان ۔

اسلم نے نیچی نظروں سے کہا ۔ ہاں ۔ رشید بھائی کے لئے اور

تمھارے لیے۔ پسند ہیں نا چیزیں ؟

رشیدہ نے تمام چیزوں کا گہری نظر سے جائزہ لیا۔ مگر آپ نے یہ تکلیف کیوں کی۔

وہ خاموش رہا۔

آپ نے اپنے لئے کیا خریدا؟

بہت کچھ! وہ ہر بات مختصر کر رہا تھا۔

رشید کہاں ہے؟

رشیدہ نے اُس کے منتشر بالوں کو دیکھا۔ وہ بھی رات گھر نہیں آئے۔

پاگل نے پھر ہانک لگائی۔ بھیڑیں راستہ بھول جاتی ہیں۔ پادری اُنھیں صحرا میں بھٹکا دیتا ہے۔

اسلم جانے کے لئے مڑا۔ اچھا میں چلتا ہوں ...... ہاں یاد آیا۔ اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ یہ لو تمھارا قرضہ۔ اُس نے دس دس کے نوٹ اُس کی طرف بڑھا دیئے۔

رشیدہ کی آواز میں خلوص سا گیا۔ میں نے آپ کو قرضہ نہیں دیا تھا یہ میں واپس نہیں لوں گی۔ رات میں آپ کا انتظار دیکھتی رہی۔ کئی بار کھانا گرم کیا۔ کئی بار آپ کے کواٹر تک گئی۔ لیکن ......

اُس نے بات پوری نہیں کی ...... قدرے توقف کے بعد وہ پھر بولی۔ پہلے آپ چائے پی لیں۔ اور ان نوٹوں کو اپنی جیب میں رکھ لیں۔

اسلم مجبور ہو گیا - مگر سنو تو .....

رشیدہ باورچی خانے میں چلی گئی - وہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے وہیں آگیا -

رشیدہ! اسلم نے کہا - جب مجھے ضرورت ہو گی تو؟

رشیدہ نے اُس کی بات کاٹ دی - آپ میرا مذاق اُڑاتے ہیں -

اُس نے اُسے ناشتہ دیا - رشیدہ کا چھوٹا بھائی بھی اُس کے ساتھ آکر شریک ہو گیا -

اسلم نے چائے پیتے ہوئے پوچھا - کیوں میاں اسکول جاتے ہو -؟

جاتا ہوں - رشیدہ کا بھائی ذہین تھا -

بڑے ہو کر کیا بنو گے ؟

وہ کھلکھلا کر ہنسا - جج - شاعر - ماسٹر -

اسلم ہنس دیا - شاعر مت بننا -

بچے کی آنکھوں میں استعجاب جاگ اٹھا - وہ کیوں چچا

شاعر ناکارہ انسان ہوتے ہیں -

آپا تو کہتی ہیں - تمھارے چچا شاعر ہیں - ایسے آدمی بہت بڑے ہوتے ہیں تم بھی شاعر بننا -

اسلم ہنستا رہا - ناشتہ ختم ہو گیا تو وہ اُٹھا - اور پاگل کے قریب جاکر کھڑا ہو گیا - پاگل کا چہرہ صبح کی نرم دھوپ میں چمک رہا تھا -

اچھا گاڈ صاحب میں اب چلا -

پاگل اس کے پاس سے ہٹ کر باورچی خانے میں چلا گیا۔

اسلم مسکرایا۔ گارڈ صاحب شاید غصے میں ہیں۔

رشیدہ نے اُسے چائے کی دوسری پیالی دیتے ہوئے کہا۔ آپ تھکے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

اسلم چونک سا گیا۔ ہاں میں سونا چاہتا ہوں۔

وہ چائے پی کر باہر آگیا۔ باہر روشن سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ غالباً وہ رشیدہ کے یہاں آرہی تھی۔

اچھی ہو روشن۔!

روشن اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ اچھل پڑی۔ بابو تم۔؟

اسلم ہنس دیا۔ میں نے کہا اچھی ہو۔

روشن کی آنکھوں میں بیچارگی سمٹ آئی۔ نہیں بیمار رہوں بابو۔ بہت بیمار۔ مجھے روگ لگ گیا ہے۔

وہ جلدی سے رشیدہ کے کواٹر میں داخل ہوگئی۔

اسلم کچھ بھی نہیں سمجھا۔ وہ سمجھ بھی کیا سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ روشن اب اس سے بہت زیادہ مذاق کرنے لگی ہے۔ گھر کے نکڑ پر دلی والی خالہ ابھی تک اپنا بایاں ہاتھ نچا نچا کر نہ جانے کسے کوس رہی تھی۔ وہ اپنے کواٹر میں آکر بان کی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اور پھر اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اور تھوڑی دیر بعد نیند کی اپسراؤں نے اُسے اپنے جھرمٹ میں لے لیا۔

ابھی ابھی دونوں سو کر اُٹھے تھے۔ کرنل اپنے گیلے بال تولیہ سے خشک کر رہا تھا۔ اور ٹیل دوسرے کمرے میں کپڑے تبدیل کر رہی تھی۔ ملازم ڈرائنگ روم کی ہر چیز قرینے سے رکھ چکے تھے۔ اور اب شبینہ بے ترتیبی کی جگہ پھر ایک سلیقہ نے لے لی تھی۔

سورج کافی بلند ہو چکا تھا۔

ٹیل بیرے کو چائے لانے کی ہدایات دے رہی تھی۔ کرنل اپنے گیلے بال خشک کر چکا تھا۔ وہ پاس والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر بغیر کسی مقصد کے اُس نے آج کا اخبار اٹھا کر اپنے سامنے پھیلا لیا۔ پہلے صفحہ پر اُس کی تصویر کے ساتھ اُس کا بیان چھپا ہوا تھا۔ کرنل نے اپنے بیان کو پڑھنا چاہا۔ لیکن چند سطریں پڑھ کر ہی وہ بور

ہونے لگا۔ اور اُس نے اخبار غیر ملکی ساخت کی مختصر سی تپائی پر رکھ دیا۔
کرنل کی آنکھیں خمار آلود ہو رہی تھیں۔ اور بھاری بھر کم وجود پر رات کے شکن آلود کپڑے اس کی ذہنی الجھن کا باعث بنے ہوئے تھے۔

اُس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں بند کر لیں۔ سر صوفے کی پشت سے لگا دیا۔ اور ایک گہرا سانس لیا۔ ایسا کرنے میں اُسے قدرے سکون ملا۔ وہ کئی منٹ تک خالی الذہن ہو کر آنکھیں بند کیے رہا۔ ٹیلی ابھی تک برابر والے کمرے میں نوکروں سے باتیں کر رہی تھی۔
معاً اُس کے ذہن کے کسی گم نام گوشے میں اذیت ناک تصور کی گھٹا نے برسنا شروع کر دیا۔ اور اس بارش میں اُس کا دل، دماغ، حافظہ، ضمیر سب کچھ بھیگنا شروع ہو گئے۔ بعض حالات میں زود پشیمانی کتنی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔
اُس نے اپنی گذشتہ زندگی کے بارے میں سوچا۔
گذری ہوئی رات کی رسوائی کے خیال نے اُس کے ذہن میں اُبھر کر ایک ہلچل مچا دی۔ اسلم نے سچ کہا تھا۔ چند مفروضہ اُصولوں کے سہارے وہ خود نسل آدم کی النساٹ کر رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے کئی ننگی تصویریں ناچ رہی تھیں۔ چکلوں بازاروں۔ شراب خانوں اور دفتروں سے، غرض سماج کے تمام تاریک نہاں خانوں سے ایک ایک تصویر لاش کی طرح اُس کے ذہن کی ساط پہ ناچ رہی تھی۔

وہ ایک بہت بڑی ٹریجڈی سے دوچار تھا۔ وہ آج تک ان لاشوں کو خود بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ جو اُس کے ذوقِ آوارگی کی تاریک قبر سے نکل کر اب اُسے گالیاں دے رہی تھیں۔ زندگی کے خزانے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ لیکن وہ تہی دامن تھا۔ اُس نے ان خزانوں کو چھوا بھی نہ تھا۔ وہ مفلس تھا۔ بدکاری وقتی عشرت کدوں کے سائے میں اُس کی جوانی اپنا روپ کھو چکی تھی۔ وہ سوچتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ زندگی اُس سے ہمیشہ دور رہی۔ وہ اس معاملہ میں سنگ دل بنا رہا۔ جس طرح عام زندگی میں مفلسی۔ مظالم اور غلاظت کو دیکھتے دیکھتے بہت سے لوگ اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی نظروں میں خود مجرم ثابت ہونے لگا۔ اُسے اپنا ایک ایک ظلم یاد آنے لگا۔ کئی یادوں نے اُس کے دل میں نشتر لگائے۔ کئی زخم خون دینے لگے۔ کئی آبلے پھوٹ گئے۔ اور اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُسے محسوس ہوا۔ جیسے وہ فراڈ ہے۔ بہت بڑا فراڈ۔ ملکوں ملکوں، اُس نے ہوس کے جال بنے۔ عورتوں کو اس جال میں اسیر کیا اور آگے بڑھ گیا۔ ہر عورت سے اُس نے وقتی محبت کی۔ جسمانی حظ حاصل کیا اور صبح ہوتے ہی اُسے دھتکار دیا۔ اور وہ جو یہ کہتا ہے۔ اب کسی دوسرے کی موجودگی میں بھی ایک سہارے کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے تو اسلم سچ کہتا ہے۔ یہ اُس کے اعصاب کی کمزوری ہے۔ اب وہ عمر کے اس مقام پر پہنچنے والا ہے جہاں

زندگی کا ہر عضو تھکا جاتا ہے۔ کاش اس وقت اسلم ہوتا اور وہ اُس کے سامنے اعتراف حقیقت کر سکتا۔

قدموں کی چاپ نزدیک ہی سُنائی دی۔ بیرے نے چائے کا سامان میز پر لگا دیا۔

تھوڑی دیر بعد۔ ٹیل کی مترنم آواز سُنائی دی۔

ڈارلنگ کیا سوچ رہے ہو؟

وہ چونک سا گیا۔ خیالات کے تار پود بکھر گئے۔ اُس نے ٹیل سے دریافت کیا۔ کیا اسلم اور اسٹیلا چلے گئے۔

ٹیل اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ یقیناً یہ ایک ناپسندیدہ حرکت تھی۔ نہ معلوم وہ دونوں کیوں چلے گئے۔

کرنل نے ٹیل کی بات کا جواب نہیں دیا۔

ممکن ہے ان دونوں کو جلدی ہو۔ یا کوئی کام ہو۔

کرنل نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

ٹیل نے توسٹ پر بہت سا مکھن لگا کر کرنل کو دیا۔ مجھے افسوس ہے۔ رات بہت جذباتی گفتگو رہی۔ لیکن فراخ دل انسان کی طرح تمہیں سب کو معاف کر دینا چاہیئے۔

اُس نے سگریٹ جلا کر ایک طویل کش لیا۔ ٹیل نے خالی برتنوں کی تپائی ایک طرف سرکا دی۔

میں شرمندہ ہوں۔ اسلم تمھارا دوست تھا۔

کرنل کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی ـــ کوئی بات نہیں۔ دوست کی ایذا پسند طبیعت ۔ کسی انقلاب کا پیش خیمہ بن جائے تو ـــ پھر اُس نے خود ہی کہا ۔ آج کا دن گرم رہے گا۔

پھر وہ دونوں خاموش ہو گئے ۔ آتش دان پر رکھا ہوا پاک مریم کا مجسمہ ۔ شاہ بلوط کی لکڑی کی صلیب ۔ اور دروازوں پر آویزاں نیلے کاٹیج کے پردے ۔ دو مضمحل سے انسان ۔ ماحول میں پُراسراریت پیدا ہوتی جا رہی تھی ۔ جیسے یہ کمرہ الف لیلٰے کے کسی غیر مرئی کردار کی رہائش گاہ ہے جہاں ابھی ابھی ایک شہزادہ آئے گا جوان سے پوچھے گا ۔ تم اداس کیوں ہو ـــ ؟

ٹیل پھر کسی ضرورت کے لئے اُٹھی اور ساتھ والے کمرے میں چلی گئی ۔ کرنل نے دیکھا گرم دنوں کی دھوپ برآمدے کی آخری سیڑھی تک آ چکی تھی ۔ اور کوٹھی کے صحن میں لگے ہوئے للی کے پھول کسی غمزدہ دُلھن کے چہرے کی طرح مُرجھائے جا رہے تھے ...... اس کے ذہن کے کسی گم نام گوشہ پر اذیت ناک گھٹا ابھی تک برس رہی تھی۔ اور اس کا حافظہ ۔ ذہن ۔ ضمیر سب اس بارش میں بھیگ رہے تھے۔

اُس نے سوچا ـــ اگر میں ٹیل سے شادی کر لوں تو ۔ یہ میرے کسی جذبہ کا ردِ عمل تو نہیں ہو گا ۔ گذشتہ رات میرا احساس برتری برہنہ ہو چکا ہے ۔ مجھے ایک دم فیلڈ آؤٹ کیا جا چکا ہے ۔ گو یہ سب کچھ خلوص سے ہوا ۔ لیکن ہوا تو ـــ پھر ٹیل سے شادی ۔ کیا میری

شکست نہ ہو گی۔؟

ٹیل ابھی واپس نہ آئی تھی......

دو دلوں کی عظیم رفاقت ایک سچائی ہے۔ روشن سچائی — میں نے رفاقت کے اس اسلوب کو کبھی احترام کا مستحق نہیں سمجھا۔ میں آج تک نہیں سوچ سکا تھا۔ زندگی مفروضہ نہیں ہے۔ زندگی وقتی جذبات کی سستی پیداوار نہیں ہے۔ زندگی سچائی کا دوسرا نام بھی ہو سکتی ہے...... اور اب جب کہ میں یہ تمام باتیں سوچ رہا ہوں — سمجھ رہا ہوں۔ میری روح ابدی رفاقت کے بطن سے پیدا ہونے والی خوشی کی متلاشی ہے۔ کیا میں اپنی عمر کا باقی حصہ اُس کی پرستش میں گذار سکوں گا...؟

ٹیل غالباً واپس آرہی تھی

پھر اس کی روح کی گہرائیوں میں اُسے ایک کرن پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُسے محسوس ہوا جیسے ٹیل رفاقت کے معاہدے کی ابدی کڑی ہے جو کبھی نہیں ٹوٹے گی — جسے وہ کبھی نہیں توڑ سکے گا۔ ٹیل کی روح میں تقدس کی ایک جھلک ہے...... ٹیل کی گناہ آلود زندگی میں ایک بہاؤ ہے اور یہ بہاؤ پاکیزگی کے ساحلوں کو بھی پا سکتا ہے۔ ٹیل کے آوارہ وجود میں ایک روشنی ہے۔ جو اب بڑھتی چلی جائے گی۔ اُس کے دل و دماغ اور حافظہ پر سے اذیت ناک تصور کی گھٹائیں چھٹتی گئیں......

بادل منتشر ہوتے گئے...... افق کی لامحدود وسعتوں میں اُن کے

سیاہ دھبے غائب ہوتے گئے۔۔۔ کرنل کے ذہن نے کروٹ بدلی۔۔۔۔۔ اناطولیہ سے لے کر یہاں تک کے سفر کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں تھا کہ وہ رفاقت کے بند مضبوں میں ہمیشہ کے لئے گرفتار ہو جائے۔

وہ واپس آچکی تھی کرنل نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا۔

ٹیل کی نظریں فرش پر جھک گئیں

کرنل نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ میں آج کل میں یہاں سے چلا جانا چاہتا ہوں۔ مگر تنہا نہیں۔ ہمیشہ کے لئے تمہیں اپنے ساتھ لے کر۔۔۔۔

ٹیل بے اختیار اُس کے سینہ سے لپٹ گئی۔

آتش دان پر پاک مریم کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ دروازوں پر نیلے کے پردے ہوا سے ہل رہے تھے۔ ماحول کی پُراسراریت میں اور اضافہ ہو چکا تھا۔ لیکن کمرہ الف لیلےٰ کے کسی غیر مرئی کردار کی رہائش گاہ کے بجائے دو محبت کرنے والوں کی رہائش گاہ معلوم ہو رہا تھا۔ جہاں کبھی کسی شہزادے کے آنے کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

•

روشن ابھی ابھی رشیدہ کے یہاں سے واپس آئی تھی۔ رشیدہ کی زبانی اُسے معلوم ہوا تھا۔ رشید گذشتہ دو دن سے گھر نہیں آیا تھا۔ اور آج رشیدہ بہت زیادہ پریشان تھی۔ بھائی کی مسلسل عدم موجودگی نے بہن کو ہراساں کر دیا تھا ...... اور اب وہ شدت سے انتظار کی گھڑیاں گن رہی تھی ——— گاڈ بھی صبح سے کچھ متفکر تھا۔ روشن سے بھی اُس نے بات نہیں کی تھی۔

روشن وہ تمام چیزیں دیکھ چکی تھی۔ جو اسلم۔ رشیدہ اور اُس کے دونوں بھائیوں کے لئے آج صبح لایا تھا۔ رشیدہ اپنی پریشانی کے باوجود اُسے تمام چیزیں خوش ہو کر دکھاتی رہی اور روشن ہر چیز کے پس منظر میں اپنی حرماں نصیبی کی جھلک دیکھتی رہی — دردناک مگر

فضول حرماں نصیبی ۔ جو گوشت کی طرح کسی پتیلی میں کبھی نہیں پک سکتی تھی ۔

وہ اپنے کواٹر کی دہلیز میں بیڑیوں کا چھابا لے کر بیٹھ گئی ۔ اُس کے ہاتھ ڈھیر سے پتوں کو بل دینے میں مشغول ہو گئے ...... اُس کی ماں آج کہیں گئی ہوئی تھی ۔ کسی رشتہ کے بھائی نے اُسے فوری بلایا تھا ۔ اور دور کے رشتے کی بوڑھی بہن آج صبح ہی گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی ۔

روشن کا ذہن سلگتے ہوئے احساس کا گہوارہ بنا ہوا تھا ۔ اُس کا حلق خشک تھا ۔ اور کسیلی تمباکو کے ذرات ہوا سے اُڑ کر اُس کی تھوڑی اور رخساروں پر چپک گئے تھے ۔ وہ دن کے ڈھل جانے کا شدت سے انتظار دیکھ رہی تھی ۔ آج اُسے اپنا درد، اور اپنا غم اسلم کو سنانا تھا ۔ وہ جانتی تھی ۔ اسلم اُس کی باتوں پر حیران ہو جائے گا ۔ وہ اس کی محبت کا سنجیدگی سے مذاق اڑائے گا ۔ اُسے سمجھائے گا ۔ اُس سے کہے گا ۔ تم پاگل ہو گئی ہو ۔ ہر جوان لڑکی جذبات کی وقتی ترنگ کو عشق سمجھ بیٹھتی ہے ۔ تم بھی اس دور سے گذر رہی ہو ۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی لڑکی نہیں تھی ۔ لیکن بساط بھر وہ سوچ سکتی تھی ۔ یہی کچھ ۔ اسلم اُسے ٹالنے کی کوشش کرے گا ۔ ممکن ہے یا وہ رشیدہ سے بھی کہہ دے رات روشن میرے پاس آئی تھی ۔ وہ بھی میری محبت میں گرفتار ہے تم اُسے سمجھاؤ رشیدہ ۔ میں تم سے منسوب ہوں ۔ ہمارے دروازوں پر مسرت کی شہنائیاں بجنے کا زمانہ قریب آچکا ہے ۔ میں تمھیں کئی

مرتبہ چشمِ تصور سے عروسی جوڑا پہنے دیکھ چکا ہوں ۔ تمہاری سہاگن زندگی کی مانگ میں چمکتی ہوئی افشاں اگر روشن نے چھین لی تو ......

اُس کا سُلگتا ہوا ذہن مجروح طائر کی طرح پھڑپھڑا اُٹھا تھا ۔ نہیں ایسا نہیں ۔ اسلم رشیدہ سے کبھی ذکر نہیں کرے گا ۔ وہ آج رات کی ہونے والی ملاقات کو ایک راز سمجھکر ہمیشہ حفاظت کرے گا ۔ اور پھر وہ کسی کی سہاگن زندگی کی مانگ میں چمکتی ہوئی افشاں کے حق میں مصیبت بننا تو نہیں چاہ رہی تھی ...... اُس کے اعصاب پر لرزہ طاری ہو گیا ۔ اگر کوئی ایسا انقلاب آجائے ۔ اور اسلم اُس کا انتخاب بھی کرلے، تو وہ انکار کر سکتی ہے ... رشیدہ کی معصوم محبت، رشیدہ کا معصوم پیار، اُسے بہت عزیز تھا ۔ وہ تو رشیدہ کی مسکراہٹوں کا طلسم برقرار رکھنا چاہتی تھی ۔ پھر آج رات وہ اسلم سے کیوں ملنا چاہتی ہے ۔ کیا صرف اپنی تحقیر کے لئے ...... پیار کی رُسوائی سے اُسے کیا مل جائے گا ۔

روشن بیڑی پر دھاگا لپیٹتے ہوتے سوچ رہی تھی ۔ اُس کا ذہن اُلجھتا جا رہا تھا ۔ مکڑی کے جالے کی طرح ۔

پھر دل ہی دل میں اُس نے خود کو سمجھانا شروع کیا ... جب ایک جذبہ جنم لیتا ہے ۔ تو اُس کے ساتھ دوسرا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے ۔ جو اُس کی ضد ہوتا ہے ۔ محبت کا درد اس درد سے قطعی مختلف ہو گا جو اسلم سے ملنے کے بعد اُس کے دل میں پیدا ہو گا ۔ وہ اس درد کے سہارے

اپنی زندگی گذار دے گی۔ جو غم آج کی رات اُسے ملے گا ۔ وہ ابدی ہوگا ۔۔ اُسے اسلم کی تائید حاصل نہ ہوگی۔ تب بھی اُس کے آنسوؤں کا ایک قطرہ اُسے آج کی ناکام ملاقات کی محرومیوں کا افسانہ سُناتا رہے گا۔

وہ اب تک ڈھیرسی بیڑیاں بنا چکی تھی۔

وقت آہستہ آہستہ گذرتا جارہا تھا ۔۔ دن کے لمحوں کا قافلہ، منزلِ شب کی طرف محو سفر تھا......

وہ جذباتی ہوتی جارہی تھی ۔ سوچتے سوچتے کئی مرتبہ اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں ۔ اور کئی مرتبہ اُسے اپنی دل کی دھڑکن رُکتی ہوئی محسوس ہوئی ۔۔ آج رات اُسے اسلم سے ملنا تھا ۔ پھر اُسے اپنا دل چھُٹتا ہوا محسوس ہوا۔ تاثرات کے بھنور اُس کے سلونے وجود کو ہچکولے دے رہے تھے ۔ اور وہ ایک بے جان تنکے کی طرح بہی چلی جارہی تھی۔

آپا نے بُلایا ہے ۔ اُس کے کانوں سے آواز ٹکرائی

اُس نے نظر اُٹھا کر دیکھا ۔ رشیدہ کا چھوٹا بھائی اُس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

وہ بیڑی میں زردہ بھرتے ہوئے بولی ۔ منے آپا نے کیوں بلایا ہے۔

منا ٹھنک کر بولا ۔ ہمیں معلوم نہیں ۔ بس بلایا ہے ۔۔ چلو ہمارے ساتھ۔

ڈوبتے ہوئے سورج کے زرد چہرے پر منتشر بادلوں کا ہجوم

چھا گیا۔

چلو منّے۔ وہ اٹھکر منے کے ساتھ ہولی۔ رشیدہ اپنے کواٹر کی دہلیز میں کھڑی اُس کی منتظر تھی۔

روشن۔ رشیدہ متفکر تھی۔ بھیا ابھی تک نہیں آئے۔ آج تین دن ہو چکے ہیں۔

روشن بھی پریشان ہو گئی۔ شاید رات تک واپس آجائیں۔

وہ دونوں دہلیز سے ہٹ کر صحن میں آکھڑی ہوئیں۔ پاگل ارنڈ کے درخت کی شاخ تھامے کھڑا تھا۔ سورج کے زرد چہرے سے منتشر بادلوں کا کثیف نقاب ہٹ چکا تھا۔

رشیدہ روشن سے کہہ رہی تھی۔ بھیّا پہلے دو تین دن کبھی نہیں رُکے۔ بہت کام ہوا تو ایک آدھ رات گھر سے باہر رہ جاتے ہیں۔ آج تو انھیں پورے تین دن ہو چکے ہیں۔ وہ روہانسی ہوتی جارہی تھی۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ اگر انھیں کچھ ہو گیا تو۔

روشن نے جلدی سے بات کاٹ دی۔ اتنی پریشان مت ہو۔ حالانکہ رشیدہ کی پریشانی دیکھکر وہ خود بھی پریشان تھی۔ پھر اُس نے کہا۔ تم نے بابو سے ذکر کیا۔؟

رشیدہ رنجیدہ آواز میں بولی۔ نہیں۔ وہ صبح ناشتہ کرنے آئے تھے۔ اُن کا کھانا میں نے وہیں بھجوا دیا تھا۔

پاگل کے چہرے کے نقوش غیر مرئی ہو رہے تھے۔ وہ بڑبڑایا۔

آخر وہی ہوا جو میری مشیت تھی۔ ایک خون۔ دو خون۔ زندگی کے چراغ میں جلنے کے لئے۔ فرشتوں کو خون کی ضرورت تھی۔ پھر وہ بستی بستی ایسے انسان کو ڈھونڈتے پھرے جو معصوم ہو۔ پاک ہو۔ اور جس نے میرے خلاف کسی سازش میں حصہ نہ لیا ہو۔

ان دونوں نے خوف زدہ نظروں سے پاگل کو دیکھا۔ وہ بدستور اپنی بڑ ہانکتا رہا۔

فرشتے اپنی تلاش میں ناکام ہوتے جا رہے تھے۔ مقدس معصوم انسان کی تلاش آسان نہ تھی۔ ہاہاہا۔ وہ وحشت ناک طریقہ پر ہنسا۔ وہ قطعاً مایوس ہو چکے تھے۔ انھیں پاک خون کی ضرورت تھی۔۔۔ ورنہ زندگی کا چراغ بجھ جاتا۔ پھر ان میں سے ایک فرشتہ میرے پاس آیا۔ ہی ہی ہی۔ اس کی اس وقت کی ہنسی ظالمانہ تھی۔ اس نے مجھے عاجزی سے سجدہ کیا۔ میری عبادت کی۔ میری حمد و ثنا کے ترانے گائے۔

رشیدہ نے بیٹے کو آواز دی

پاگل گرجا۔ نادانو! میری بات سنو۔ فرشتہ کی حالت پر مجھے رحم آگیا۔ خدا سب پر رحم کرنے کے لئے ہے۔ وہ رو رہا تھا۔ جانتے ہو فرشتہ رو رہا تھا۔ کئی دن سے اس نے شیو بھی نہیں بنایا تھا۔

پریشانی کے باوجود وہ دونوں بے اختیار ہنس پڑیں۔

پاگل جوش میں آگیا۔ ہنسو خوب ہنسو۔ آنسوؤں کی راہوں پر

بھی تو تمھیں کو سفر کرنا ہے۔ خوب ہنس لو۔ ہنسی کے اس خزانے کو چاروں طرف بکھیر دو۔۔۔۔۔۔

روشن اب تک ہنس رہی تھی۔ گاڈ صاحب۔ پھر وہ فرشتہ پاگل کو غالباً اپنی بات یاد آگئی۔ ہاں اُس نے کئی دن سے شیو بھی نہیں کیا تھا۔ اُس کی پتلون کی کریز خراب تھی۔ اور وہ ریڈ لیمپ کا سگریٹ پی رہا تھا۔ اُسے اس حالت میں دیکھکر مجھے رحم آگیا۔ میں نے اُس سے کہا۔ میرے فرشتے مایوس نہ ہو۔ زندگی کا چراغ کبھی نہیں بجھے گا۔ موت کی ظلمت تو انسان کے لئے تحفہ ہے۔ عظیم تحفہ۔ اور میں اُسے زندہ رکھکر ذلیل کرنا چاہتا ہوں۔ اُس نے اُڑتی ہوئی مکھی کو ہاتھ سے پکڑ کر مسل ڈالا۔ پھر میں نے فرشتہ کو ایک ایسے انسان کا پتہ بتا دیا۔ جو معصوم تھا۔ مسیح کی بھیڑ کی طرح معصوم۔

گاڈ صاحب ایسی باتیں نہ کرو مجھے ڈر لگتا ہے۔ رشیدہ نے پریشان ہو کر کہا۔

ایک صحت مند نوجوان۔ خالص۔ خون۔ ہڈیوں کا ملبہ، گوشت کی کرچیوں کا پھیلاؤ۔ وہ بے تحاشہ چلّایا۔ یہ سب واہیات باتیں ہیں فرشتہ نے اپنا کام کیا۔ اور آسمانوں کی طرف پرواز کر گیا۔ وہ میرا ممنون ہے۔ میں عنقریب اُس کے مرتبہ میں اضافہ کرنے والا ہوں۔

رشیدہ پاگل کی باتوں سے گھبرا گئی۔ میں بھیا سے کہوں گی۔ وہ گاڈ صاحب کو یہاں سے لے جائیں۔ ان کی باتوں سے مجھے اب

خوف آنے لگا ہے۔

پاگل نے تالیاں بجا کر کہا۔ بھیا سے کہوں گی۔ خوف۔ خالص خون۔

رشیدہ تڑپ کر چلائی۔ گاڈ صاحب بکواس مت کرو۔

روشن نے منّے کو آواز دے کر کہا کہ وہ اسلم بابو کو بلا لائے۔

مُنّا بھاگتا ہوا چلا گیا۔ رشیدہ کی آنکھیں نمناک ہو چکی تھیں — وقتی پریشانی نے اُسے جذباتی بنا دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اسلم اپنی آنکھیں ملتا ہوا آ گیا۔ معلوم ہوتا تھا۔ وہ آج سارا دن سوتا رہا ہے۔ اُس کے بال منتشر تھے۔ اور انگلیوں پر سگریٹ کے بجے ہوئے دھوئیں کے نشانات بہت زیادہ نمایاں ہو رہے تھے۔

روشن کو اپنا سارا وجود لوہے کا ایک سرد ٹکڑا معلوم ہوا وہ دھیمی آواز میں اُس سے بولی۔ رشیدہ بہن بہت پریشان ہیں۔ رشید بھائی آج تین دن سے گھر نہیں آئے ہیں۔

رشیدہ نے نیچی نظروں سے کہا۔ بھیّا نہ معلوم کیوں نہیں آئے۔ آپ تو جانتے ہیں وہ کبھی اتنے غیر حاضر نہیں رہے۔ پھر اُس نے پاگل کی طرف دیکھتے ہوئے شکایتاً کہا۔ اور گاڈ صاحب کی باتوں نے مجھے سراسیمہ کر دیا ہے۔ ہزاروں خدشے میرے دل میں پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ جب تک بھیّا نہ آ جائیں۔ آپ انھیں اپنے یہاں لے جائیں۔

پاگل اُچھل اُچھل کر اُڑتی ہوئی مکھیاں پکڑ رہا تھا۔ انسان کی غذا

سے بچ سا ہوا۔ خالص عرق۔ اُس نے مکھی کو پکڑ کر مسل ڈالا۔ میرے تقسیم کئے ہوئے نودق کا ایک حصہ تو یہ اُڑا جاتی ہے۔

اسلم نے رشیدہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ پاگل کی باتوں کا کیا۔ میں کوشش کروں گا۔ میرے ساتھ چلا چلے۔ پھر اُس نے پریشان بالوں کی لٹ کو ہاتھ سے درست کرتے ہوئے کہا۔ اب سورج غروب ہو چکا ہے۔ رشید عموماً دس گیارہ بجے تک گھر آجاتے ہیں۔ آپ اور انتظار دیکھیں۔ قدرے توقف کے بعد اُس نے کہا۔ بات پریشانی کی ضرور ہے۔ اگر آج بھی وہ نہ آئے تو صبح میں خود تلاش کروں گا۔

اُس نے پاگل کو اشارے سے اپنے قریب بُلانا چاہا۔ لیکن پاگل نے نفی میں سر ہلا دیا۔ منا کواٹر کے کمرے میں گھسا ہوا کہانی کی کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اور باہر گلی میں مدراسی خاندان کے بے ہنگم بچے، ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ ٹیلر ماسٹر کے کواٹر سے فہا لوئن کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔

رشیدہ نے اُسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چولھے پر چائے کی کیتلی میں پانی گرم ہو چکا تھا۔ رشیدہ کے کہنے پر روشن نے چائے کی پیالی بنا کر اسلم کو دی۔

اسلم نے روشن کو مخاطب کیا۔ چائے کے ساتھ ایک تازہ بڑی بھی تو پلاؤ۔

پاگل نے ایک اور اُڑتی ہوئی مکھی کو پکڑ کر مسل ڈالا۔ ابھی تو

دھواں اٹھ رہا ہے۔ کل تک شرارے بھی بھڑکنا شروع ہو جائیں گے۔۔۔ اے روح القدس۔

آپا روح القدس صاحب کیا کام کرتے ہیں۔ منّے نے کمرے میں سے چلاّ کر پوچھا۔

پریشانی کے باوجود وہ سب ہنس دیئے۔ روشن اپنے کوارٹر تک گئی ہوئی تھی اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کچھ بیڑیاں تھیں۔۔۔

تم تو بیڑیاں لے بھی آئیں۔ اسلم ہنسا۔ کاش میں کوئی گرانڈیل قسم کی فرمائش کرتا۔۔

رشیدہ نے روشن کو چائے کا کپ دیا۔ تم بھی تو بیٹھو۔

بیٹھنے کی بجائے وہ اسلم کی پشت کی طرف آ کر کھڑی ہو گئی۔ اسلم نے رشیدہ سے پوچھا۔ تم پاگل کی باتوں پر اعتقاد رکھتی ہو۔

رشیدہ نے اپنی گردن کو خفیف سی جنبش دی۔ اعتقاد ہے بھی اور نہیں بھی۔۔

اور تم روشن۔۔ اسلم نے مڑ کر اپنی پشت کی طرف دیکھا۔

روشن جواب دینے کے بجائے ہوا سے اڑتے ہوئے آنچل کو اپنے سر پر درست کرنے لگی۔

اسلم نے دونوں کو سمجھانا چاہا۔ ہمارے ذہنوں میں اعتقاد کا وجود صرف یوں ہی نہیں آجاتا۔ اعتقاد کے پس منظر میں کچھ ایسے سماجی محرکات

ہوتے ہیں۔ میں تمھیں کس طرح سمجھاؤں۔ اُس نے ایک عجیب سی اُلجھن محسوس کی۔ وہ بہت پڑھی لکھی لڑکیاں نہیں تھیں۔ اور اُن کے لئے اُسے الفاظ کا انتخاب کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ بس یہ سمجھ لو.....

پاگل صحن کے کچے فرش پر بیٹھ کر چلّایا۔ کون سمجھے جس نے آدم کو گندم بالیں کی طرف لپکنے کی تلقین کی تھی۔

اے روح القدس۔ آدم اپنے گناہ کی پاداش میں آسمان سے زمین پر آیا ــــــــ

منا کمرے میں سے پھر چلّایا۔

آپا۔ یہ روح القدس کب آتے ہیں؟

اسلم ہنستا ہوا جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے رشیدہ سے کہا۔ رشید کے آتے ہی مجھے مطلع کر دینا۔ وہ دروازے پر پہنچ کر بولا ــــــ آج شام میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔

رشیدہ کے چہرے سے مانوس حیا جھلک رہی تھی۔ شام کا روزہ آپ نے کب سے رکھنا شروع کر دیا۔

آج دن بھر سوتا رہا۔ مستقل آرام سے معدہ صاحب خفا ہیں۔ وہ جاتے جاتے کہنے لگا۔ آج کھانے میں روشن کی شرکت یقینی ہونی چاہیے ــــ اور ان بٹیریوں کا شکریہ۔

روشن کو پھر اپنا سارا وجود سرد لوہے کے ٹکڑے کی طرح معلوم ہوا۔ رشیدہ کا انگ انگ پیار کی بسیں روشنی سے جگمگا رہا تھا۔

میں چراغ جلا آؤں ۔ معلوم نہیں ماں آئی کہ نہیں۔
رشیدہ نے چولھے میں آگ کو درست کیا ۔ کھانا ساتھ کھاؤ گی نا؟
تمھارے بابو کا حکم ہے اس لئے ۔
روشن کھل اٹھی ۔ یہی سمجھ لو ۔

روشن کی ماں ابھی تک اپنے دور کے رشتہ کے بھائی کے یہاں سے واپس نہیں آئی تھی ۔ روشن نے لال ٹین جلا کر کوٹھڑی کی دہلیز سے اپنا سارا سامان اٹھا کر کمرے میں رکھ دیا ۔ بیڑیوں کے کٹے ہوئے پتے تمباکو کا چھابہ، شکستہ سی دری ۔ اُس کی بے نام روزی کا یہ وہ سامان تھا ۔ جو پورے کنبے کی کفالت کر رہا تھا ۔

وہ دروازہ بند کر کے صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹ گئی ۔ اُس کی نظریں گرم رات کے اندھیروں کی وسعتوں میں بے مقصد بھٹکنے لگیں ۔ اُسے اندھیروں کا دل کانپتا ہوا محسوس ہوا ۔ رات کے چند خاموش گھنٹے گذر چکے تھے ۔ وہ چارپائی پر پڑی ہوئی تھی ۔ اور اس کا تصور پاگل کے ارد گرد منڈلا رہا تھا ۔

کوئی جیتی ہوئی بازی ہار جاتا ہے ۔۔۔۔ دو خون ۔۔۔۔ زندگی کا بجھتا ہوا چراغ ۔۔ فرشتے کی اعانت آسمان سے برستی ہوئی گوشت کی کرچیاں ۔۔۔ پاگل کی کہی ہوئی ایک ایک بات نقش بن کر اس کے دل پر ابھرتی جا رہی تھی ۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں سوچ سکتی تھی کہ جیسے کچھ ہونے والا ہے ۔۔۔۔۔۔ جیسے کوئی بہت بُری خبر آنے

والی ہے۔ اور اس خبر کو سُن کر سب رونے لگیں گے۔ .... اور وہ بھی آنسوؤں اور ہچکیوں کے پھیلے ہوئے خنک دھندلکوں میں گم ہو جائے گی۔

اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ضرور آج کچھ ہونے والا ہے۔ اس کی روح ایک عجیب قسم کا اضطراب محسوس کر رہی تھی۔ نہ تو چمکتے ہوئے ستاروں میں اُسے روشنی نظر آئی اور نہ دل کشی۔ ستارے آسمان کی پلکوں پر ٹھہرے ہوئے آنسو دکھائی دے رہے تھے ——— اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ——— ضرور آج کچھ ہونے والا ہے۔ جب پچھلے سال اُس کے بوڑھے باپ کا ایک حادثے میں انتقال ہوا تھا۔ اُس رات بھی اُس پر ایک ایسا ہی کرب طاری تھا ——— ایک ناقابلِ بیان وحشت۔ جس کے سرے بہت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ اعتقاد جیسی باتوں کی بحث نہ تو کر سکتی تھی اور نہ اس لفظ کے معنی ہی جانتی تھی۔ بس اُسے تو اتنا پتہ تھا کہ پاگل کی باتیں ہونے والے تغیرات کی طرف اُس کے ذہن کی بھرپور رہنمائی کر چکی تھیں ——— اور اُس کی روح تسلیم کر چکی تھی کہ آج کچھ ہونے والا ہے .... خدا خیر کرے۔ اُس نے منہ ہی منہ میں کہا اور کروٹ بدل لی۔

پاگل اُس کے لئے ایک پُراسرار انسان بن چکا تھا۔ اور اس کی باتیں یقین کا چشمہ ——— ڈاکٹر اور اسلم بابو کچھ بھی کہیں۔ لیکن اُس کے پاگل پن

میں جو جلال وجمال تھا۔ اُس کی بے نور آنکھوں میں جو غیر مرئی طاقت تھی۔ اُس کی اداؤں میں جو سحر تھا۔ اُس کی آواز میں جو تلوار جیسی کاٹ تھی — ان سب کو وہ کیسے جھٹلا سکتی تھی — ڈاکٹر اور بابوان بھیدوں کو کیا جانیں۔

اُس کی بوڑھی ماں رشتہ کے بھائی کے یہاں سے ابھی تک واپس نہیں آئی تھی —

وہ چارپائی پر پڑے پڑے جاہل دماغ سے اپنے المیہ اور طربیہ زندگی کے مسائل کا تجزیہ کر رہی تھی۔ اسلم جب رشیدہ کے یہاں آیا تھا اور اُس کا سارا وجود لوہے کے سرد ٹکڑے کی طرح ہو گیا تھا تو جسم کی ساری حرارت اُس کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ اُس نے بڑے غور سے اسلم کے سراپا کا جائزہ لیا تھا۔ امکان بھر اپنی دہکتی ہوئی آنکھوں سے اُس کے ذہن میں بھی جھانکنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کی اداؤں اور باتوں کے قرینے میں لگاوٹ اور محبت کے منہ بند شگوفوں کی دنیا تلاش کرنی چاہی تھی۔ ان مختصر سے لمحوں میں بساط بھر اُس نے اسلم کے دل کی کتاب کا ہر ورق دیکھنا چاہا تھا .... لیکن وہ کوئی ایسی بات نہیں دیکھ سکی۔ جو ایک محبت کرنے والے انسان کے سینہ میں خلش بن کر کھٹکا کرتی ہے اور درد بن کر راتوں کی نیند اڑائے رہتی ہے۔ نہ تو اُسے اسلم کی باتوں میں محبت کے منہ بند شگوفوں کی دنیا نظر آئی، اور نہ لگاوٹ کا افسوں — وہ بس عام انسانوں کی سی باتیں کرتا رہا۔ جس طرح ایک عام

انسان دوسرے جانے پہچانے انسان سے باتیں کرتا ہے —— وہ اس معاملے میں زیادہ تجربہ کار نہیں تھی ...... اُس نے اب تک اسلم کے سوا کسی سے عشق نہیں کیا تھا — اگر وہ دو چار عشق لڑا چکی ہوتی تو معاملہ کو ایک نظر میں ہی بھانپ لیتی۔ مگر حیرت تو یہ تھی اس جیسی اناڑی لڑکی بھی اسلم کے دل کا کھوج نکال چکی تھی، اور یہ فیصلہ دے چکی تھی کہ اس دل پر بے کواڑوں کے کواٹر میں رہنے والی رشیدہ کے پیار کی ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی ہے ....

پاگل کا کہا ہوا جملہ پھر اُس کے کانوں میں گونجا۔

کوئی جیت کر بھی بازی ہار جاتا ہے

وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ چارپائی پر اُٹھ بیٹھی — وہی مانوس اندھیروں کی وحشت ناک وسعتیں، وہی مقام، وہی بیان، اور آسمان پر رینگتی ہوئی کہکشاں کا وجود ——

اُس کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے نمودار ہونے لگے — جیسے اُس کے چاروں طرف جہنم جل رہے تھے۔ آج ایک نئے احساس نے اُس کے دل میں جاگ کر یہ ہلچل مچادی تھی۔

اب اُسے اور بھی یقین ہو چلا تھا کہ — حالات کی بازی ہمہ گیر انداز میں بدلنے والی ہے۔ اور اگر یہ بازی بدل گئی تو —— وہ آگے کچھ نہیں سوچ سکی۔ جب ہوا کا جھونکا اُس کے عرق آلود ماتھے کو چھوتا ہوا گذرا تو اُسے معلوم ہوا۔ کوئی کواٹر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

اتنی رات گئے آئی ہے ماں ۔۔ اس نے دروازہ کھول دیا
ہاں بیٹی ۔۔ کام کی باتوں میں دیر ہو جایا کرتی ہے ۔ جمن ہانپتی ہوئی اندر آگئی ۔۔

وہ رشیدہ کے کواٹر کی طرف لپکی ۔

اب کہاں چلی ۔ بوڑھی جمن چلائی

وہ جواب دیئے بغیر ۔ رشیدہ کے کواٹر پر پہنچ کر رکی ۔ اور جب اس نے کھڑکی نما روشن دان سے جھانک کر دیکھا تو رشیدہ سو چکی تھی اور اس کا چھوٹا بھائی ۔ اس کے گلے میں ہاتھ ڈالے معصومیت کے گہوارے میں جھول رہا تھا ۔۔ روشن کو احساس ہوا ۔ رات کافی ہو چکی ہے ۔۔ اسے خیال بھی نہیں رہا ۔ اور رشیدہ اس کا انتظار دیکھتے دیکھتے سو گئی ۔ ۔ ۔ ۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے واپس لوٹ آئی

جمن اپنی چارپائی پر لیٹ چکی تھی ۔ اس کے ضعیف اعضا ، سفر کی تھکن سے پور پور تھے ۔ دور کے رشتہ کے بھائی نے اسے کراچی بلا کر اس کے ساتھ خوفناک مذاق کیا اور اب وہ اس خوفناک مذاق کا خمیازہ کراہ کراہ کر بھگت رہی تھی ۔ روشن اس کے قریب اپنی چارپائی بچھا کر لیٹ گئی ۔ جمن کراہتے ہوئے اٹھ بیٹھی ۔۔۔ تیرے ماموں مفلو نے کچھ بتایا تھا ۔۔ ؟

روشن نے بے دلی سے کہا ۔ ماموں فضلو اچھے ہیں ۔۔

جمو شفقت سے بولی۔ ہاں ٹھیک ہے۔

روشن نے رسماً پوچھا۔ ماموں کیا باتیں کرتے تھے۔؟

جمو ہولے سے بولی۔ رشتہ کی۔

روشن چونک سی گئی۔ کس کے ؟

جمن اپنا منہ چلا کر بولی۔ تیرے رشتے کی

روشن جھجک گئی۔ ماں تجھ سے ہزاروں مرتبہ کہا۔ تو ماموں فضلو کے یہاں کی کوئی بات مجھ سے نہ کہا کر۔

لو اور لو۔ لونڈیا کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جمن چیخی۔ پہلے خود پوچھتی رہی اور اب لگی باتیں ملانے۔

جمن بڑبڑاتے ہوئے پھر لیٹ گئی۔

روشن جیسے انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ ماموں فضلو۔ پستہ قد، جاہل، سزایافتہ اور ایک مفت کماؤ۔ نکھٹو بیٹے کا باپ۔ جسے برادری والوں نے اپنی لڑکی دینے سے انکار کر دیا تھا اور جو اب دو سال سے اس کی ماں کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اور جو ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا۔ دیکھ جمن۔ میرا لڑکا ہزاروں میں ایک ہے۔ راج کرے گی تیری بیٹی۔ اور روشن جب اپنے ماموں سے یہ سنتی تھی تو اس کا خون کھول اٹھتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں جھنجلاتی۔ راج کرے گی تیری بہو یا فاقے۔ اور اگر وہ اس کا ماموں نہ ہوتا تو۔ اب تک کئی مرتبہ اسے گھر سے نکلوا دیا ہوتا۔ نگوڑا اسنڈا۔ جو روشن کو ماموں سے کہیں زیادہ بگرا دکھائی دیتا تھا۔

جمن اپنی دانست میں روشن کا جی جلاکر سو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد روشن نے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ اُسے ہر چیز اونگھتی ہوئی دکھائی دی۔ ایک زہریلا خواب اور افسوں جس نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جو کوارٹروں کی تڑخی ہوئی دیواروں میں چھپے ہوئے جھینگروں کا ساز ینہ بن کر زمین سے آسمان تک پھیلا ہوا تھا۔

اُس نے جانے کے لئے چارپائی پر سے پاؤں اُتارے۔

جمن بلند آواز سے خرّاٹے لے رہی تھی۔

اُس نے احتیاطاً اماں کی گہری نیند کا جائزہ لیا۔ دبے پاؤں صحن عبور کیا۔ دروازہ کھولا اور باہر آگئی۔ کاغذی کوارٹروں کی دور تک پھیلی ہوئی قطاریں۔ تاریک آسمان کی بیوہ بیٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسی بیوہ بیٹیاں دق کے کلبلاتے ہوئے جراثیم جن کے پھیپھڑوں کو چاٹ چکے تھے۔

وہ اندھیرے میں آگے بڑھتی گئی۔ گلی کا آوارہ کتا اُسے دیکھ کر بھونکا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے رُکی اور پھر جھپاک سے اسلم کے کوارٹر میں داخل ہوگئی۔ اسلم صحن میں بے خبر سو رہا تھا۔ اُس کے چاروں طرف ادھ جلے سگریٹ بکھرے پڑے تھے۔ اور کمرے میں لال ٹین کی مدھم روشنی تھی جو دہلیز تک آکر دم توڑ دیتی تھی۔

وہ اُس کے سرہانے پہنچ کر رُک گئی۔ اُس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اور ہوا چلنے کے باوجود اُس کا جسم پسینہ میں شرابور تھا۔

اُس نے خیال کیا وہ کسی ٹھنڈے دریا میں کود کر نکلی ہے۔

اسلم گہری نیند سو رہا تھا۔

اُس نے اُسے اٹھایا نہیں۔ وہ چارپائی کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔ وہ اگر تھوڑی دیر اور کھڑی رہتی تو گر پڑتی۔ اُس کے جسم کا بند بند کانپ رہا تھا۔ وہ عجیب سی اُودھیڑ بن میں گرفتار تھی۔ وہ اُسے اُٹھا کر کیا کہے گی۔ کیسے کہے گی۔

وہ چارپائی کے پاس زمین پر بیٹھی ہوئی اسلم کے خواب آلود چہرے کو گھورتی رہی۔

پھر اُس کی روح کی گہرائیوں سے ایک آواز کرن بن کر پھوٹی۔ ایک ارادے نے جنم لیا۔ ایک خواہش نے انگڑائی لے کر اپنی چٹکی سے اسلم کو بیدار کر دیا ——

اسلم بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا — کون — روشن۔ تم۔ خیر تو ہے۔

اُس میں نہ جانے کہاں سے اطمینان آ گیا۔

"ہاں، میں"۔

وہ گھبرایا ہوا تھا۔

"اس وقت کیسے آئیں"؟

روشن نیچی نظروں سے زمین کریدتی رہی۔

آخر کچھ کہو نا۔

"کیا رشید آ گیا"؟

روشن نے اپنی آنکھیں اُس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"ابھی تک نہیں آیا"

اسلم پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ روشن کی غیر متوقع آمد کا مقصد وہ اب بھی نہیں سمجھا تھا۔

روشن آہستہ سے بولی۔

اُس کی آواز میں درد تھا ـــ بابو ـــ میں بہت دلوں سے سوچ رہی تھی۔ کبھی دلوں سے میں باتیں کرنا چاہتی تھی ـــ آج میں ہمت کر کے تم تک آگئی۔

اسلم نے اطمینان کا سانس لیا۔

"تو اس روگ میں تم بھی گرفتار ہو"

روشن کی باتوں میں وقار تھا۔ تم میرا مذاق اڑا سکتے ہو۔ میں پہلے ہی سب کچھ سوچ چکی تھی۔ بدنامی ـــ رُسوائی ـــ تمھاری جھڑکیاں ـــ میں ان سب باتوں کے لئے تیار ہو کر آئی ہوں

اسلم چارپائی سے اُتر کر اُس کے قریب بیٹھ گیا۔

"تم چاہتی کیا ہو روشن ۔ ؟"

روشن اب بے جھجک باتیں کر رہی تھی ـــ کچھ بھی نہیں۔ اور بہت کچھ ـــ بابو تم کہو گے یہ کیا بات ہوئی ـــ ہاں بہت سی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں ـــ بظاہر بیکار ۔ بے مطلب ـــ مگر ان کے معنی ضرور ہوتے ہیں ـــ ہوتے ہیں نا بابو ـــ ؟ روشن نے استفہامیہ

نظروں سے اسلم کو دیکھا۔
اُس نے تائیداً اپنا سر ہلایا—— ہاں۔
روشن کے لہجے میں ٹھہراؤ آچکا تھا۔ اب تم میرے آنے کا مطلب سمجھ سکو گے۔ بابو۔ خدا کی قسم۔ اب تم سے کوئی بات چھپانا کیا۔ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ میں نے دنوں اس راز کو اپنے سینہ میں چھپائے رکھا۔ میں اس آگ کو اپنے سینہ سے لگائے پھری —— میں جانتی ہوں تم دل میں ہنس رہے ہو گے۔ ہنسو۔ بابو میری حالت ہی کچھ ایسی ہے۔ ایک بیڑیاں بنانے والی تین پیسے کی چھوکری۔ ایک پڑھے لکھے لڑکے سے عشق کرنے اُس کے کوارٹر میں آئی ہے۔
اسلم بڑی توجہ سے اُس کی باتیں سُن رہا تھا
بابو میں بہت بُری ہوں۔ ایک بات کو بھی چھپا کر نہیں رکھ سکی۔ نہ جانے کیوں آج میں نے اچانک یہ فیصلہ کر لیا کہ میں تمھیں سب کچھ بتا دوں گی۔ میرے دھڑکتے ہوئے دل نے کہا۔ جتنی جلدی ہو اس درد کی شدت کو بابو کو دکھا دے۔ میں پڑھی لکھی عورت نہیں۔ میں دل کی باتوں میں آگئی۔ خدا کی قسم۔ میں یہاں اس لئے نہیں آئی ہوں کہ تمھیں اپنا بنا لوں۔ یا تمھاری ہمدردیاں حاصل کر لوں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس میرے دل نے کہا۔ یہ تیری روح کی گہرائیوں سے پیار کی جو لہر اُٹھتی ہے اُسے بابو کو دکھا دے۔ پھر میں اُسے دکھانے آگئی۔ اُس نے اپنے خشک ہونٹوں پر کئی بار زبان پھیری——

تمھاری شادی رشیدہ سے ہو رہی ہے۔ خدا مبارک کرے۔ وہ میری بہن ہے۔ اُس کا سہاگ، اُسے مبارک رہے۔ میں تو یوں ہی آ گئی تھی .... وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

اب میں چلی ـــــ مجھے معاف کرنا۔

اسلم نے اُس کا بازو پکڑ کر بٹھا دیا ـــ وہ اُس کے سر پر گرتے گرتے بچی۔

روشن! میری طرف دیکھو۔ اسلم کو اس سے گہری ہمدردی پیدا ہو چکی تھی ـــ میری باتوں پر یقین کرو گی؟

کیوں نہیں

اسلم نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ روشنی میں تمھارا چہرہ دمک اٹھا تھا۔

روشن اُس کا منہ دیکھتی رہی۔

ہاں تو میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔ رشیدہ اور تمھارا پیار میرے لئے برابر ہے۔

روشن چیخ پڑی۔ ... بابو ... اُس کے کانوں میں ہر بول دستک کی آواز بن کر پہنچا ـــــــ وہ حیرت زدہ تھی ـــ اُس کا خیال کتنا صحیح نکلا ـــ اُس نے ٹھیک ہی تو سوچا تھا ـــ اسلم کے دل کے ورق پر رشیدہ کی محبت کا ہلکا سا نقش بھی نہ تھا ـــــــ

روشن اسی عالم میں بولی۔ اور رشیدہ سے شادی۔

اسلم سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولا۔ رشید نے ایک مرتبہ مجھ سے تذکرہ کیا تھا۔ اور میں اُس وقت خاموش رہا۔ تم اسے میری گھٹیا مصلحت پسندی یا اخلاق کی غلط پاسداری کہہ سکتی ہو۔ لیکن یقین کرو روشن اس طویل عرصہ میں ہمیشہ میں نے رشیدہ کو پیش نظر رکھا۔ رشید کے ان گنت احسانات۔ مجھے اس سے محبت کرنے پہ مجبور کرتے تھے ـــ میں نے خلوص سے اُس کی پرستش کرنی چاہی ـــ اُس کے قریب آنا چاہا۔ رشیدہ کے وجود کو اُس کے پیار کو اب تک میں ایک سچائی سمجھتا ہوں۔ دنیا کی عظیم ترین۔ صداقت۔ اور اس صداقت کو میں نے اپنانا چاہا ـــ دلوں میں اسی ایک تصور سے اُلجھارہا ـــ کئی راتیں میری پلک جھپکائے بغیر گزر گئیں۔ میں سوچتا رہا ـــ سوچتا رہا ـــ لیکن اس لڑکی کا تصور میرے لئے برف کی سِل بنا رہا ـــ پھر وہ تاسف بھرے لہجہ میں کہنے لگا۔ ان ہی دلوں مجھے ایک فیصلہ کرنا پڑ گیا ـــ اور وہ فیصلہ رشیدہ کے خلاف تھا۔ میں جانتا ہوں۔ یہ فیصلہ اگر اُسے میں سُنا دیتا تو رشیدہ کی معصوم آنکھیں آنسوؤں سے آباد ہوتیں اور رشید کا دل ٹوٹ جاتا۔

روشن جیسے گہرے کنوئیں میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

میں اس خیال سے اب تک خاموش ہوں۔ تم میرے لئے بہت زیادہ قابل احترام ہو۔ شکریہ۔ تم نے مجھے پیار کے قابل تو سمجھا ـــ تمہارے جذبات کی سطح کتنی بلند ہے ـــ میں اب تک ایک حقیقت کو

چھپائے رہا۔ اور تم اس کا اظہار کر رہی ہو ۔ بغیر کسی جھجک کے تمھاری محبت ۔ تمھاری سیدھی سادی زندگی کی عکاسی ہے اور اس کا فراخ دلانہ اعتراف ۔ میرے احساس کے لئے ایک طمانچہ ہے۔ ایک بھرپور وار اور ضمیر کے لئے ایک کھلا چیلنج ۔

روشن نے درمیان میں بولنا چاہا۔ لیکن آواز اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی ......

رات کے اندھیروں کی گھمبیرتا میں اسلم کی آواز پھیلتی رہی ۔ تم صبر سے میری بات سنو۔ اس عرصہ میں کئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں ۔ اور کئی اب پیدا ہوتی جا رہی ہیں ۔ جہاں میں ان لوگوں کا ممنون احسان ہوں وہاں اب مجھے رشید کی عزت کا پاس بھی کرنا پڑ رہا ہے ۔ گلی میں ایک ایک کو معلوم ہو چکا ہے ۔ رشیدہ میری منسوبہ ہے ۔ واقعہ کی اس اس شہرت میں میرا کردار ایک خاموش تماشائی کا سا رہا ہے ۔ میں کڑھتا رہا ہوں ـــــ اور ایک مرتبہ میں نے رشیدہ سے بھی مفصل بات کی ـــ اسے سمجھایا ۔ اپنے پریشان وجود سے گھن دلانے کی کوشش کی ۔ مگر وہ بڑے اعتماد سے کہتی رہی ۔ بھیا نے جو کچھ کیا ہے وہ ٹھیک ہے ۔ میں زیادہ پڑھی لکھی لڑکی نہیں ہوں ۔ میں ان باتوں کو نہیں جانتی .... رات کا ایک اور گھنٹہ بغیر کسی آہٹ کے گذر گیا ۔ اس نے دوبارہ سگریٹ جلایا ۔ روشن کے شاید اوسان بجا نہیں تھے۔ حالات کے نئے انکشاف نے اس سے سوچنے سمجھنے کی طاقت چھین لی تھی ۔

روشن کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی — بابو — یہ سب کیا ہو گیا۔ پھر اس نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ رشیدہ کی شادی بھی اب نہیں ہو گی — تم بھی تو سچ کہتے ہو — وہ بہت زیادہ متاثر تھی — جو کچھ ہو چکا ہے۔ اُسے ہو جانے دو — اب جو کچھ ہو — وہ اس طرح ہو کہ رشیدہ صدمہ سے تباہ نہ ہو جائے .....

روشن خاموش ہو گئی — اُس کا جی اُمنڈا آ رہا تھا۔ رشیدہ کے غم کو وہ شدت سے محسوس کر رہی تھی — اُس کے جذبات کی تحقیر نہیں ہوئی تھی — لیکن ایک دوسری عورت کے جذبات کو تو ٹھکرایا جا رہا تھا — جو اس سے بھی کہیں زیادہ بدقسمت ثابت ہوئی تھی — اُس کی پیشانی پر شکنیں پڑنی شروع ہو گئیں — ناگواری کے تلخ احساس نے آنسوؤں کی شکل اختیار کر لی اور وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کر رونے لگی — اُس نے دبی دبی سسکیوں کے درمیان کہا — تم لوگ کتنے ظالم ہوتے ہو .... جسے تم مصلحت کا نام دے رہے ہو نا بابو — وہ ظلم ہے — وفورِ غم سے اُس کی آواز کانپ رہی تھی — تم پہلے ہی یہ سب کچھ بتا دیتے — رشیدہ کچھ روز رو دھو کر صبر کر لیتی — لیکن اب — جب اُسے تمھارا فیصلہ معلوم ہو گا تو وہ مر جائے گی ....

روشن کے ساتھ ہر چیز رو رہی تھی .... اپنے احساس کی پاسداری کے بجائے ایک عورت دوسری عورت کے انجام سے متاسف تھی — محبت کی مماثلت نے ان کے غموں کو ایک جیسا بنا دیا تھا.....

اسلم کی روح پر ندامت طاری ہو چکی تھی۔

روشن نے بڑی دیر بعد چلتے ہوئے اس سے پوچھا ۔۔ بابو رشیدہ کی زندگی بچانے کے لئے کبھی تم اس سے شادی نہیں کر سکتے۔

اسلم شرمندہ تھا ۔۔ رشیدہ کچھ دنوں بعد مجھے بھول جائے گی ۔۔ جذبات کا یہ چڑھتا ہوا طوفان ۔۔ وقت کے ساتھ ساتھ اترتا جاتا ہے روشن۔ میں ملمع سازی کا قائل نہیں ہوں ۔۔۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ تم خود سوچنا ۔۔ یہ کتنی تکلیف دہ بات ہو گی ۔۔۔ میں عمر بھر جھوٹ بولتا رہوں ۔۔۔ پھر میری زندگی ۔۔۔ میرا مستقبل ۔۔ اور یہ کہتے کہتے اس کی نظروں میں اٹیلا کا تصور پھر گیا جو کل ایمپریس مارکیٹ کے پاس اس کے انتظار میں کھڑی ہو گی۔

روشن جانے کے لئے مڑی ۔۔ اسلم نے اس سے دریافت کیا۔ کیا تم یہ باتیں رشیدہ سے کہہ سکو گی ۔۔؟

نہیں ۔۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔

پھر جب وہ گلی عبور کر کے اپنے کوارٹر میں داخل ہو رہی تھی تو معاً اس کے ذہن کا ایک ایک تار بج اٹھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے، اس کی روح اب نئی راہوں پر سفر کر رہی ہے ۔۔ اور اس کے چاروں طرف جو اندھیرے ہیں وہ سمٹتے جا رہے ہیں' اور جب وہ چارپائی پر لیٹی ہے تو اس کی مصیبت میں ایک گونا سکون پیدا ہو چکا تھا ۔۔ اور اپنے دل میں وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اگر اسلم رشیدہ سے پیار نہیں

کرتا تو وہ اُسے ہر قیمت پر اپنائے گی۔ چاہے اُسے کیسی بھی قربانیاں دینا پڑیں۔ اُس نے چارپائی پر کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

اب رشیدہ کا غم۔ رشیدہ کا تصور اُس کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ ہمدردی کے جذبات کی عمر بہت کم ہوا کرتی ہے ...... اب جذبات کی جگہ ایک ایسے احساس نے لے لی تھی۔ جو روشن کے دھواں دھواں ذہن میں انگارہ بن کر پرورش پاتا رہا تھا ـــــــ وہ بابو کو جیت لے گی۔ اپنائے گی۔ وہ ہر طاقت کو شکست دے سکتی ہے .... گہری نیند کی خوش گوار جھیل میں وہ ڈوبتی گئی .... وہ ہر طاقت کو شکست دے سکتی ہے ...... وہ بابو کو جیت لے گی۔ نیند کی جھیل میں سے ایک موج اُٹھی اور روشن کے سراپا کو بھگوتی ہوئی گذر گئی۔

رات کسی شرابی کی طرح آسمان پر جھوم رہی تھی

کواٹروں کی تڑخی ہوئی دیواروں میں جھینگروں کے ساز نیم مدھم ہوتے جا رہے تھے۔ گلی کا کتا کبھی کبھی بھونک اٹھتا تھا۔

روشن کے چلے جانے کے بعد اسلم نفسیاتی شرمندگی کے الاؤ میں گھرا بیٹھا تھا۔ وہ خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ اور مجرم انسان کا ذہن جسمانی عقوبت کی شاہراہوں پر رات کی تنہائیوں میں اسی طرح بھٹکا کرتا ہے۔

رشیدہ مر جائے گی

روشن کے کہے ہوئے الفاظ ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پر برس رہے تھے۔

وہ رشیدہ کو مرنے نہیں دے گا

زندگی اُس کے ساتھ انصاف نہیں کر سکی۔ یہ ٹھیک ہے۔ زندگی کسی کے ساتھ انصاف نہیں کرتی۔ احساس کے مختلف عوامل کے بکھرتے رنگ اُس کے ذہن پر چھاتے رہے۔ زندگی بذات خود کسی سے انصاف نہیں کرتی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی سے انصاف طلب کیا جاتا ہے۔ رشیدہ نے لاشعوری طور پر زندگی کو للکارا۔ انصاف مانگا اور اُسے انصاف مل گیا۔ روشن نے اپنے پیار کی داستان کو پھیلانا نہیں چاہا۔ وہ محبت کی تمہید تک رہی۔ اُس نے اپنی جو حد مقرر کی وہ اُس میں کامیاب ہے۔ اب رہا وہ۔ تو اُسے بھی تو حق پہنچتا ہے کہ وہ زندگی سے انصاف طلب کرے۔ اپنی خواہشات کے تاج محل کو سجائے۔ اور ایلا کی سنہری زلفوں کی نرم چھاؤں میں۔ کسی نغمہ کی سحر طراز دُھن کو چھیڑ کر جھوم اُٹھے۔ اُس کے ایسا کرنے سے رشیدہ کو رنج ضرور ہوگا۔ روشن بھی تھوڑے دن آہیں بھرے گی۔ اُس کی سلونی رنگت پر مجروح جذبات کی زردی چھا جائے گی۔ مگر یہ دونوں سب کچھ بھول جائیں گی۔ ہر غم ان کی حافظہ کی بھٹی میں جل جائے گا۔ ماضی اُن کے لئے خواب ہوتا چلا جائے گا۔ ایک دُھندلا سا خواب۔ اور پھر ایک دن، یہ دونوں۔ ان راہوں کی طرف پلٹ کر دیکھنا بھی

گوار نہیں کریں گی۔

بہت جلد اُس نے خود کو مجرموں کے زمرے سے نکال لیا۔ اب وہ بھی مطمئن تھا۔ حیاتی عقوبت کی شاہراہوں پر بھٹکتے بھٹکتے اُسے ایک منزل مل چکی تھی۔ اور اب اسے جلد سے جلد اس منزل تک پہنچنا تھا۔

باہر گلی میں اُس کا نام لے کر کسی نے آواز دی

گلی کا کُتا زور زور سے بھونکنے لگا

وہ جلدی سے باہر آگیا۔ جہاں دو اجنبی چہرے اُس کے منتظر تھے۔

کہیے کیا کام ہے؟

اُن میں سے ایک نے اُسے بغور دیکھ کر کہا۔

"اسلم آپ ہی کا نام ہے"

جی ہاں۔ وہ عجیب الجھن میں تھا۔ رات کا آخری حصہ دو اجنبی شخص، اور اُن کے اُترے ہوئے چہرے۔

اب دوسرے شخص نے کہا۔ ہم لوگ پانی کی ٹنکی کے پاس سعود آباد میں رہتے ہیں۔

سعود آباد۔ اسلم قریب قریب چڑ سا گیا۔ بہت خوشی کی بات ہے۔ آپ غالباً راستہ بھول گئے ہیں۔؟

پہلے شخص کے چہرے پر غم کی لکیریں ابھر آئیں۔ نہیں یہ بات نہیں آپ رشید کو جانتے ہیں۔ وہ بولتا گیا۔ وہ ہمارا دوست تھا۔ ہم

ایک ساتھ گاڑی چلاتے تھے۔ اس نے قدرے رُک کر کہا — آج شام......

اسلم متوحش انداز میں بولا۔ آج شام کیا ہوا رشید کو ؟

دوسرے شخص نے کہا۔ ایکسیڈنٹ۔ بیچارہ سول ہسپتال میں پڑا ہے۔ گنتی کے سانس ہیں۔

اسلم نا قابلِ اعتبار لہجے میں چیخ پڑا — یہ سب کیسے ہوا۔

پہلے شخص نے تاسف بھری آواز نکالی۔ خدا کی مرضی سے ہوا — ہم ساڑھے بارہ بجے تک اُس کے پاس ہسپتال میں رہے۔ اب ایک بجے کی لوکل سے واپس آئے ہیں۔

دوسرے شخص نے بات ختم کرنے کی نیت سے کہا۔ وہ اکثر آپ کا ذکر کرتا تھا۔ ہم لوگ اطلاع کرنے آئے ہیں۔ شاید وہ مرچکا ہوگا۔ فوجی ٹرک نے اُس کے جسم کی کرچیاں کر دیں۔

اسلم کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اب کیا وقت ہے ؟

اب دوسرا شخص ہی بول رہا تھا۔ پورے ڈھائی بجے ہیں — آپ جلد جائیں۔ ممکن ہے آپ کے پہنچنے تک وہ زندہ رہ جائے...

پہلے شخص کے لہجے میں غم انگیز جھنجھلاہٹ تھی۔ نہیں جی وہ مرچکا ہوگا۔ اُس کے دل کے قریب زخم آئے تھے۔ جسم کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ داہنی طرف کی تمام پسلیاں رگڑ سے سُرمہ ہو گئی تھیں۔

وہ انھیں اسی طرح چھوڑ کر کمرے میں آگیا۔ حادثے میں رشید

مجروح نہیں ہوا تھا۔ رشید کی پسلیاں نہیں ٹوٹی تھیں۔ رشید مرنے والا نہیں تھا۔ بلکہ وہ خود موت جیسی کیفیت میں مبتلا ہو کر بہت جلد مرنے والا تھا۔ اُسے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا۔ رشید کا جیتا جیتا خون، ٹوٹے ہوئے اعضاء، الجھتے ہوئے آخری سانس۔ اس کا دہاڑیں مار کر رونے کو جی چاہا۔

وہ بہت دیر تک کمرے کے کچے فرش پر بیٹھا ہوا اس صدمے سے دوچار رہا۔

رشید سول ہسپتال میں پڑا تھا۔ جو مر چکا ہوگا۔ یا اب مرنے والا ہوگا۔ اور جس کی بہن آج تین دن سے بے کواڑوں کے کواٹر میں بیٹھی اس کا انتظار دیکھ رہی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیا کرے۔ رشیدہ کو کس طرح بتائے۔ کیا وہ یہ الم ناک خبر سنانے کے لئے آج یہاں آیا تھا۔۔

وہ رشید کی غم انگیز حالت کے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ اس جاں گسل اور سیاہ موت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جو کئی مہلک زخم بن کر رشید کے خون کو تارکول کی سڑک پر بہا چکی تھی۔ ظالم موت۔ جو ایک وزنی حادثہ بن کر اس کی ہڈیوں کو چبا چکی تھی۔۔۔۔۔

اس کا خیال اپنی جگہ ٹھیک تھا۔ اس سیاہ موت کو اس سماج نے پیدا کیا تھا۔ رشید جس کا ایک حقیر فرد تھا۔ ایک ارذل ترین رینگتا ہوا کیڑا۔ جسے آج سماج کے بطن سے پیدا ہونے والی موت نے اپنے پاؤں تلے

روندھ دیا۔

رشید یقیناً مر جاتے گا۔ اُسے شہر کی وہ سڑکیں کھا گئیں۔ جن کے بے رحم پتھریلے سینے پر وہ اپنی رکشا دوڑایا کرتا تھا۔ جو اپنی جوان بہن اور معصوم بھائی کا پیٹ پالنے کے لئے اپنی مضبوط ٹانگوں کی طاقت سے تھل تھل کرتے جسموں کا بار گھسیٹتا تھا۔ نہ معلوم ایسے کتنے رشید روز مر جاتے ہوں گے۔ جن کی بہنوں کو خبر بھی نہ ہوتی ہوگی۔ اور وہ انتظار دیکھتے دیکھتے عمر بھر کے لئے اپنے بھائیوں سے بدگمان ہو جاتی ہوں گی۔ وہ کہتی ہوں گی۔ بھیا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔

اے میری بہنو! وہ رو پڑا۔

تمھیں چھوڑ کر کوئی نہیں جاتا۔ تمھارا پھول سا وزن کسے بار ہوگا۔ کوئی بھائی تمھاری رفاقت سے نہیں کتراتا۔ تم انتظار دیکھتی رہتی ہو۔ اور تمھارے بھائی رشید کی طرح موت کی آغوش میں جا سوتے ہیں۔

اے میری بہنو!

بھائی بے وفا نہیں ہوتے۔ بھائی بزدل نہیں ہوتے۔ بھائی دل آزار نہیں ہوتے۔ بھائی اپنی بہنوں سے پیار کرتے ہیں۔ مزدوری کرتے ہیں۔ رکشائیں گھسیٹتے ہیں۔ چوریاں کرتے ہیں۔ اپنی کنواری بہنوں کا پیٹ پالنے کے لئے محنت کے تپتے ہوئے صحراؤں سے گذرتے ہیں۔ کوئی ان صحراؤں سے گذر جاتا ہے۔ اور کوئی اُن کی آتشیں وسعتوں میں کھو جاتا ہے۔ اور بہنیں سمجھتی ہیں۔ بھائی انھیں چھوڑ کر

چلا گیا۔

اس کی روح خون رو رہی تھی۔

بھائی کبھی اپنی بہنوں کو چھوڑ کر نہیں جاتے۔ کیا کل رشیدہ بھی یہی کہے گی۔ رشید اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ نہ جانے کہاں ـــ نہیں نہیں۔ رشید سب کے سامنے دیکھتے دیکھتے سماج کی ان خلیجوں کی نذر ہوا ہے۔ جہاں لاکھوں کروڑوں بھائی اب سے بہت پہلے اسیر کئے جا چکے ہیں۔ رشیدہ کا گریاں چہرہ اُسے اپنے قریب محسوس ہوا۔ وہ اسی عالم میں روشن کے کوارٹر کی طرف بھاگا۔

گلی کا کتا ایک بار پھر زور سے بھونکا۔

روشن۔ روشن۔ رات کے سناٹے میں اسلم کی آواز بازگشت بن کر گونجی۔ اور روشن کی ابھی آنکھ لگی ہی تھی۔ اس نے ہڑبڑا کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ جبتن بھی بیدار ہو چکی تھی۔

روشن نے اسلم کی غیر حالت کو دیکھکر وحشت ناک لہجے میں پوچھا خیر تو ہے۔ کیسے آئے۔؟

اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ روشن۔ وہ بات کرنے سے پہلے ہی رونے لگا۔ رشید ہم سب کو چھوڑ کر چلا گیا۔

روشن چلائی۔ بابو خدا کے لئے ہوش میں آؤ۔

اسلم کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ ہاں روشن ابھی آدمی آئے تھے رشید کے دوست۔ وہ سول ہسپتال میں بستر مرگ پر پڑا ہے۔

خدا معلوم --- زندہ ہے بھی کہ نہیں ۔سنتی ہو۔ روشن میں کون سے دل سے رشیدہ کو اس سانحے کی خبر کروں ۔

بابو کیوں آیا ہے بیٹی ۔ جمن اپنی چارپائی پر سے بولی

تم اندر آجاؤ۔ اُس نے اسلم کو اندر بلا لیا ۔

روشن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں ۔ماں رشید کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔

ماں کانپتی ہوئی آواز میں بولی ۔ ہائے اللہ اب کیا ہوگا ؟

اسلم سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا ۔ تم رشیدہ کو جگاؤ ۔ اب تین بج چکے ہیں ۔ اسٹار گیٹ تک ہمیں پیدل چلنا ہو گا ۔ وہاں یقینی کوئی ٹیکسی مل جائے گی ۔

روشن جانے لگی

اسلم نے پھر کہا ۔ ٹھہرو میں بھی چلتا ہوں ۔ رشیدہ سے کوئی بات نہ کرنا ۔ بس یہی کہنا ہے رشید نے بلایا ہے ابھی ۔ وہ باتیں کرتے ہوئے کواٹر میں داخل ہو گئے ۔ رشیدہ سو رہی تھی ۔ اُس کا چھوٹا بھائی بھی سو رہا تھا اور پاگل کمرے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا ۔

پاگل انھیں دیکھ کر بولا ۔ آ گئے ۔ بولو جھوٹ بولو ۔ سازشیں گرد اُس نے بلند قہقہہ لگایا ۔ کوئی جیتی بازی ہار گیا ۔ پاگل کی باتوں کا انداز دہشت ناک تھا ۔ اسلم نے اُسے گھور کر دیکھا ۔

پاگل پھر چلّایا ۔ جھوٹ بولو ۔ دیکھی جھوٹ کی سزا ۔

گاڈ صاحب۔ اسلم کے لہجے میں سختی تھی۔ خاموش رہو۔ پھر اُس نے رشیدہ کو آواز دی۔ رشیدہ۔ رشیدہ غم کی شدت آنسوؤں کی طرح چھلکی جا رہی تھی۔

رشیدہ نے انگڑائی لی اور آنکھیں کھول دیں۔

اسلم غم انگیز لجاجت سے بولا۔ جلد ہی اُٹھ جاؤ۔ ہمیں کراچی چلنا ہے۔ روشن بھی ہمارے ساتھ چلے گی۔

رشیدہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ بھیا کیسے ہیں۔

اسلم نے بدقت آنسوؤں کو پیا۔ بھیا اچھے ہیں۔ اُنھوں نے ہی بلایا ہے۔

رشیدہ اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے ان دونوں کی پریشانی کا جائزہ لیا۔ نہیں۔ آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ ضرور کوئی بات ہے۔

روشن ضبط کے باوجود رونے لگی۔ اُسلم نے سوچا اب چھپانا بیکار ہے۔

پاگل طنزیہ انداز میں بولا۔ اے روح القدس جھوٹ کی سزا ابدی لعنت ہے۔ میرا ابدی قانون اٹل ہے۔

رشیدہ۔ کسی مجروح کی طرح تڑپ کر بولی۔ مجھ پر رحم کرو۔ خدا کے لئے بتاؤ بھیا کیسے ہیں۔؟

اسلم کانپتی ہوئی آواز میں بدقت بولا۔ رشیدہ وہ ایک حادثہ کا شکار ہو گیا۔ ہمیں سول ہسپتال چلنا ہے۔

رشیدہ اپنی پوری طاقت سے چلائی۔ "میرے بھیا"۔ اور پھر اُس کی آواز حلق میں گھٹ سی گئی۔ وہ بے سُدھ ہو کر بے جان لاش کی طرح گر پڑی۔ جیسے خزاں رسیدہ پتہ۔

روشن اس پر جھک گئی

رشیدہ کا چھوٹا بھائی بھی جاگ اٹھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی بے ہوش بہن کو دیکھ رہا تھا۔

اسلم کو محسوس ہوا جیسے اُس کا دل شق ہو گیا ہے۔ اور دل کے ایک ایک ٹکڑے سے خون کی بوندیں ٹپکنا شروع ہو گئی ہیں۔ وہ رشیدہ کے سرہانے بیٹھ گیا۔ روشن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

پاگل اپنی انگلیوں پر نہ جانے کیا حساب لگا رہا تھا۔

اسلم کی آواز میں گہری ہمدردی تھی۔ وہ اس پر جُھک گیا۔ رشیدہ رشیدہ، اسلم ہوے سے بولا۔ آنکھیں کھولو۔ روشن روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ میری بنو۔ رشیدہ۔ بابو تمہیں آواز دے رہے ہیں۔

رشیدہ نے غم سے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ میرا بھیا کہاں ہے۔ میں بھیا کے پاس جاؤں گی۔ وہ بے تحاشہ روتے ہوئے بولی۔ مجھے لے چلو۔ اُس نے پھر چیخ ماری۔ میرا بھیا میرا لال۔

اسلم نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ہاں ہم ابھی چلیں گے۔ تم پہلے خود کو تو سنبھالو۔

اُس نے چھوٹے بھائی کو سینہ سے لپٹا کر رونا شروع کر دیا۔ ننھے

تمھارے بھیا چلے گئے۔

اسلم کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں ——۔

رشیدہ کی غم انگیز چیخوں سے پاس پڑوس کے سب لوگ جاگ چکے تھے۔ مدقوق ٹیلر ماسٹر باہر کھڑا ہوا ایک ایک کو آوازیں دے رہا تھا۔ مدراسی خاندان معہ اپنے بچوں کے باہر گلی میں جمع تھا۔ دلی والی خالہ بھی باہر نکل آئی تھی۔

اسلم نے باہر آ کر ان سب کو تفصیل سے واقعہ سنایا۔

ٹیلر ماسٹر کا چہرہ اُتر گیا۔ مدراسی خاندان کے لوگ اپنے بچوں عجیب سی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ دلی والی خالہ رات بھر جاگنے کے خوف سے واپس اپنے کوارٹر میں گھس گئی۔

ٹیلر ماسٹر نے اسلم سے پوچھا۔ اب کیا ارادہ ہے؟

اُس نے بتایا۔ ہم لوگ سول ہسپتال جا رہے ہیں۔

ماسٹر نے اپنے تعاون کی پیش کش کی۔

شکریہ، ماسٹر آپ تکلیف نہ فرمائیں۔

پھر وہ واپس اندر آ گیا۔ رشیدہ بدستور رو رہی تھی۔ روشن اُسے سنبھالے بیٹھی تھی۔ اور پاگل صحن میں بیٹھا ہوا بے سرو پا باتیں کر رہا تھا ——

رشیدہ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ایک مجروح ہو جانے والے بھائی کی یاد میں بہن آنسو بہا رہی تھی۔ اور ستارے آسمان پر

پگھل پگھل کر لامحدود خلاؤں میں تحلیل ہو رہے تھے۔ ایک بے آسرا بہن رو رہی تھی ۔۔۔

سعود آباد ملیر مہاجر کالونی کے ایک نیم پختہ کوارٹر میں گذرتی رات کا دامن تھام کر ایک بدنصیب لڑکی رو رہی تھی ۔ روئے جا رہی تھی۔ اور وقت اُس کے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے بھی گذرے چلا جا رہا تھا۔ یہ ایک غریب رکشا، چلانے والے بے نام انسان کی بہن کا غم تھا۔ جس کا بھائی سول ہسپتال کراچی کے جنرل وارڈ میں پڑا دم توڑ رہا تھا یا دم توڑ چکا تھا۔

ایک غم نصیب بہن رو رہی تھی۔

آنسوؤں سے آنچل بھیگ چکا تھا۔ یہ گھر کی موت تھی ۔۔۔ انفرادی موت ۔ جس کے اثرات ۔ گنتی کے چند لوگوں نے محسوس کیے تھے ۔ اور گنتی کے چند لوگ ہی یہ سمجھ رہے تھے ۔ کہ رشید کی موت شہر کی سڑکوں کے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عمل میں آئی تھی ان شاہراہوں پر ۔ ایک رشید نہیں ہر روز نہ معلوم کتنے رشید دم توڑ دیتے ہیں ۔ اور غم نصیب بہنیں ان کی موت کی خبر سُن کر اسی طرح روتی ہیں ۔ بین کرتی ہیں ۔۔ اور ساری عمر ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں۔

اسلم خاموش کھڑا ہوا تھا

روشن اُس سے مخاطب ہوئی ۔ بابو چلو گے نہیں

رشیدہ نیم بیہوش سی ہو رہی تھی ۔ اور اس کا چھوٹا بھائی سہما سا

گیا تھا۔

اسلم نے چلتے ہوئے کہا۔ تم رشیدہ کو سنبھالو۔ میں اسٹار گیٹ سے ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔ اور روشن بیٹے کو تم اپنی چارپائی پر سلا آؤ۔

اُس نے باہر آ کر ٹیلر ماسٹر کو آواز دے کر بائیسکل لانے کو کہا۔

ٹیلر ماسٹر نے اپنی بے نور آنکھیں جھپکاتے ہوئے بائیسکل اس کے حوالے کر دی۔

وہ نہ معلوم کس طرح اسٹار گیٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد اُسے ٹیکسی مل گئی۔ اور جب وہ واپس آیا ہے تو روشن بیٹے کو اپنی چارپائی پر سلا آئی تھی۔ اور رشیدہ ابھی تک نیم بیہوشی کی حالت میں پڑی ہوئی سسکیوں سے رو رہی تھی۔

باہر گلی میں کوئی باتیں کرتا ہوا گزر رہا تھا

کتا اپنی غمناک آواز میں بھونکا۔

اسلم نے روشن کو بتایا کہ ٹیکسی آ چکی ہے —— پھر وہ رشیدہ پر جھک گیا۔ چلو رشیدہ۔

ہمت کرو۔ اُس نے اُسے سمجھایا۔ اب رونے سے کیا ہو گا۔ دل کو مضبوط رکھو۔

روشن نے رشیدہ کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔

وہ تینوں ٹیکسی میں آ کر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ کتا ایک بار پھر بھونکا۔ اور کار اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔

اب ساڑھے چار کا وقت ہو چکا تھا۔ آسمان کے دور دراز گوشوں پر زرتار جالوں کی چادر پھیلتی جا رہی تھی۔ اور ستاروں کی چمک پھیکی پڑ چکی تھی۔ ہنگامے جاگنے والے تھے۔ اور زندگی کے ساکت ماحول میں لرزشوں کا طوفان آنے والا تھا۔

رشیدہ کی دبی دبی سسکیاں اسلم کے کانوں سے ٹکراتی رہیں۔

راستہ تمام ہوتا گیا

جب کار سول ہسپتال کے مین گیٹ پر پہنچ کر رکی ہے تو صبح کی روشنی ہو چکی تھی۔ اسلم نے روشن کے ساتھ رشیدہ کو سہارا دے کر اتارا۔ ٹیکسی والے کا حساب کیا اور پھر وہ تینوں تھکے تھکے قدموں سے جنرل وارڈ کی طرف چل دیئے۔ جنرل وارڈ زیادہ دور نہیں تھا برآمدے کے عین سامنے سپید کپڑوں میں ڈیوٹی نرس کرسی پر بیٹھی ہوئی اونگھ رہی تھی۔ وہ تینوں ٹھٹھکتی ہوئی فرض شناس نرس کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ اسلم نے نرمی سے نرس کو مخاطب کر کے رشید کے بارے میں دریافت کیا۔ کرسی پر نیم دراز نرس، اس کی آواز سن کر اچھل سی پڑی۔ پھر دوسرے ہی لمحہ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے بدستور نیند جھلک رہی تھی۔

آپ اس کا رشتہ دار ہے؟

ہاں وہ میرا دوست تھا۔ اس نے رشیدہ کی طرف اشارہ کیا۔

یہ اُس کی چھوٹی بہن ہیں۔

نرس جلدی جلدی بولی۔ امارا نام نورا ہے۔ ام نے تمھارا مریض کا کھوب کھدمت (خدمت) کیا۔ وہ چلتے ہوئے کہنے لگی۔ مگر تین بجے کے قریب اس کا دم آکھر ہو گیا۔ تم لوگ صبر کرے گا۔

وہ سب رشید کے بے جان جسم کے پاس کھڑے ہو گئے۔ رشیدہ نے کمبل اٹھا کر اپنے مرجانے والے بھائی کی صورت دیکھی پھر وہ لاش سے لپٹ کر رونے لگی

رشید کا بے جان جسم لوہے کے پلنگ پر پڑا تھا۔ اُس کے زخموں سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ نرس آہستہ سے بولی۔ مسٹر ام کیا کرے۔ ایک بجے کے بعد مریض مچھلی کے مانک تڑپنے لگا۔ ہم ڈاکٹر رحمان کے پاس گیا۔ ام بولا مریض کی حالت کھراب ہے وہ بولا۔ ام آرام کرتا ہے۔ بڑے ڈاکٹر سے بولو۔ ام بڑے ڈاکٹر سے بولا وہ ایک گھنٹہ بعد آیا۔ اُس وقت تک یہ بیچارہ برف کی مانک ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ نرس کو جیسے واقعی افسوس تھا۔ بیچارہ کا کھون بہت کھلاص ہو گیا تھا۔ ساری رات بیہوش پڑا رہا۔ مرنے سے تھوڑی دیر پہلے چند منٹ کو اپنا ہوش ٹھیک کیا۔ کسی کا نام لے کر تھوڑی دیر ہلا کیا اور پھر کھلاس ہو گیا۔ ام کیا کرتا۔ وہ بولتے بولتے رشیدہ کی طرف پلٹی۔

بی بی۔ صبر کرو۔ ایسا روئے گا تو تم بیمار ہو جائے گا۔

اسلم نے پانچ روپیہ کا نوٹ نکال کر نورا کو دیا۔ میں ضروری تکمیل

کے بعد لاش کو لے جانے کا انتظام کرتا ہوں۔

لوزا نے نوٹ لے کر اپنے سیاہ پرس میں رکھ لیا۔ ادھر والا برآمدے میں ڈیوٹی ڈاکٹر ہوگا۔ وہ گریب کی موت کا لکھی پڑھی کرے گا پھر تم لاش لے جا سکتا ہے۔

اسلم نے رشید کے بے جان جسم کو دیکھا۔ اُسے اب محسوس ہوا جیسے رشید ابھی ابھی رکشا چلا کر آیا ہے اور تھک کر گہری نیند سو گیا ہے رشیدہ میری طرف دیکھو۔ اُس کی آواز میں درد تھا۔

رشیدہ نے آنسو بھری آنکھوں سے اسلم کی طرف دیکھا

اسلم غم انگیز متانت سے بولا۔ اب مت رونا۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا۔ وہ ضروری امور کی تکمیل کے لئے چلا گیا۔ رشیدہ نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ روشن نے رشید کا منہ کمبل کے کونے سے ڈھانک دیا۔

صبح کی زرد دھوپ ہال کے روشن دان سے گذرتی ہوئی دوسرے مریضوں کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ لوزا ایک اور مریض کو دوا پلا رہی تھی روشن کو ایک عجیب سی بو کا احساس ہوا۔ جو کمرے میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بیڈ نمبر ۴ کا مریض مسلسل کھانس رہا تھا۔ اور اُس کے پاس لیٹا ہوا ایک بوڑھا سوتے میں اپنے پیٹ کو بری طرح کچو کے دے رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا اس کے پیٹ میں سخت درد ہے اور اُسے مارفیا کا ٹیکہ دیا گیا تھا۔ بیڈ نمبر ۲ پر ایک جلی ہوئی لڑکی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ اُس کا چہرہ خوفناک طریقہ پر جھلسا ہوا تھا۔

اور ابھی تک اُس کی سڑی ہوئی کھال سے پانی کی گدلی گدلی بوندیں ٹپک کر بستر میں جذب ہو رہی تھیں۔

ضروری اندراجات کے بعد اسلم کو لاش لے جانے کی اجازت مل گئی۔

وہ باہر مین گیٹ پر آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیش نظر لاش لے جانے کا مسئلہ تھا۔ اُس نے اپنی جیب کا جائزہ لیا۔ جس میں صرف پچاس روپے باقی بچے تھے۔ اور یہ رقم صرف رشید کے کفن دفن کی کفالت کر سکتی تھی۔ وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ ٹیکسی لینے کا یہ مطلب تھا کہ پھر قرضہ کے لئے دوڑ دھوپ کی جائے۔ اور اتنے عرصہ لاش گھر پر پڑی رہے۔ اُس نے سوچا اس وقت اخبار کا اڈیٹر جو اُس کا دوست تھا۔ چاہے تو کام آ سکتا ہے۔ وہ اس سے موٹر مانگ سکتا تھا۔ لیکن مشکل تو یہ تھی۔ اڈیٹر دس بجے سے پہلے دفتر آتا نہیں تھا۔۔۔

نصف گھنٹہ گذر جانے کے بعد بھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔

غریب کی زندگی سے کہیں زیادہ اُس کی موت اُس کے لئے مشکلات کی آئینہ ہوا کرتی ہے۔ اُس کا ذہن ادھر اُدھر بھٹک رہا تھا پھر اُسے دور سے کرنل کی کیڈلک گاڑی آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہی جانی پہچانی شان دار کیڈلک۔ جس میں کرنل کے ساتھ وہ بیٹھ چکا تھا۔ وہ سڑک کے وسط میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اور جب وہ قریب آئی تو اُس

نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ کرنل خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ کار ایک خفیف سے جھٹکے کے بعد رُک گئی۔

کرنل متحیر تھا۔ ہلو۔ مسٹر اسلم۔ خیر باشد۔ یہ صبح ہی صبح کدھر۔

اسلم نے اُسے مختصراً بتاتے ہوئے کہا۔ مجھے تمھاری کار چاہیئے۔

کرنل کار سے اُتر پڑا۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ میں خود بھی شریک ہوتا۔ لیکن میں انتہائی اہم کام کے سلسلہ میں ایوانِ تجارت تک جا رہا ہوں۔ آپ میری کار لے جا سکتے ہیں۔

اسلم نے کرنل کا شکریہ ادا کیا۔ پھر میں آپ سے کہاں ملاقات کروں۔

کرنل نے اخلاص بھرے لہجے میں کہا۔ نیچ لکثری کے مینجر سے آپ مل لیں۔ وہ مجھے آپ سے ملا دے گا۔

اسلم نے کار کا اسٹیرنگ سنبھال کر ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کیا۔ اور کرنل اپنے قریب سے گذرتی ہوئی ایک بس میں اُچھل کر داخل ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ تینوں کرنل کی کیڈلک گاڑی میں رشید کی لاش لیئے اپنے کواٹر کی طرف جا رہے تھے۔

رشیدہ راستہ بھر خاموش رہی۔ کبھی کبھی سرد آہ اُس کے ہونٹوں پر ضرور مچل جاتی تھی۔

روشن۔ رشید کے بے جان جسم کو سہارا دیئے سامنے لگے ہوئے شیشہ میں اسلم کا غم زدہ چہرہ دیکھ رہی تھی۔

سفر طے ہو گیا۔ اُس نے کار رشیدہ کے کواٹر کے سامنے روک

دی ـــــ

رات کو بھونکنے والا کتا دُم ہلاتا ہوا آگے بڑھا۔

گلی میں ایک ہنگامہ جاگ اٹھا۔ عورتیں دروازوں کی اوٹ سے جھانکنے لگیں۔

مدقوق ٹیلر ماسٹر جلدی سے کار کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

مدراسی خاندان کے سیہ فام بچے ہاتھوں میں مٹی لئے کار کے پیچھے کھڑے اچھل کود رہے تھے۔

پاگل کھڑکی نما روشندان سے جھانک رہا تھا۔

وہ رشید کے بے جان جسم کو اپنے ہاتھوں پر لے کر کوارٹر میں آگئے۔ روشن نے جلدی سے چارپائی ایک طرف ڈال دی۔ ٹیلر ماسٹر سر کی طرف تھا۔ رشیدہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ منا غالباً روشن کے کوارٹر میں کھیل رہا تھا۔

وہ جب لاش کو چارپائی پر رکھ چکے تو اسلم نے ٹیلر ماسٹر کو روپے دیتے ہوئے کہا۔ کفن اور قبر کی تیاری آپ کا کام ہے!

ٹیلر ماسٹر سر جھکائے چلا گیا۔

اسلم باہر آگیا۔ پاس پڑوس کی عورتیں رشیدہ کے کوارٹر میں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ جمن منے کو لا چکی تھی۔ اور رشیدہ کے رونے کی دل خراش آواز گلی کے آخیر سرے تک سنائی دے رہی تھی۔

آنے والوں کے چہرے غم سے سنولائے ہوئے تھے۔ رشید کی

ناگہانی موت کا سب کو صدمہ تھا۔ ان لوگوں نے ایسی موتوں کے کئی دل خراش مناظر دیکھے تھے۔ وہ جس سماج کے فرد تھے۔ وہاں موت ناگہانی طریقہ پر ہی آیا کرتی ہے۔ حادثے۔ ایکسیڈنٹ۔ قتل۔ دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کے نقوش مٹ جاتے ہیں۔ اسی لئے غمناک زندگی کے طویل دور نے ان سے وہ جھجک چھین لی تھی۔ جو اس قسم کی موتیں دیکھکر ایک عام آدمی کو محسوس ہوتی ہے۔

پاگل کواٹر میں روشن سے الجھ رہا تھا۔ اے روح القدس خدا کا دوست مر گیا۔ میری ربوبیت کی ایک قدر مفلوج ہو گئی۔ اے گنہگار عورت، ان پہاڑوں سے میں تیرے لئے ٹکرایا ہوں۔

جب شور زیادہ بڑھ گیا تو اسلم مداخلت پر مجبور ہو گیا۔

گاڈ صاحب۔ باہر آجاؤ۔ اُس کے لہجے میں حکم تھا۔ چلو باہر چلو۔ اُس نے پاگل کو ہلکا سا دھکا دے کر باہر کر دیا۔

ٹیلر ماسٹر تمام تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جنازہ تیار ہو گیا۔ مردوں کو کواٹر میں بلا لیا گیا۔ رشیدہ کو پردے کا ہوش بھی نہیں تھا۔ اُس کی آنکھیں سوج رہی تھیں۔ اور وہ اپنے مردہ بھائی کی پٹی پکڑے مسلسل رو رہی تھی۔ اسلم اس کے برابر دوزانو بیٹھ گیا۔ ایک مرتبہ پھر کفن کھول کر دوسرے مردوں کو مرحوم کی صورت دکھائی گئی۔ رشید سو رہا تھا۔ اس نیند سے اسے کوئی بیدار نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کے زخم ابھی تک خون

دے رہے تھے۔ جوان خون سفید کفن پر دھبے ڈال چکا تھا۔۔

اسلم بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ اب میرا ٹرام پٹے کے پاس کوئی انتظار نہیں رکھے گا۔ آنسو اس کے رخساروں پر مچل رہے تھے۔ رشید تم ہمیشہ کے لئے جا رہے ہو۔ وہ رشید کے رخساروں پر اپنا منہ رگڑ رہا تھا۔ ہم تمھیں منوں مٹی کے نیچے دابنے لے جا رہے ہیں۔ تم مر گئے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ تم ہمیشہ موت کے دہانے پر کھڑے رہے۔ پھر ایک جھونکا آیا۔ اور تم ناہموار اور مضطرب نظامِ زندگی کے منہ پر تھوکتے ہوئے اس دہانے میں گر پڑے۔ تمھارے پیروں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ فرد کی آسائشوں کا دعوے دار سماج۔ اپنے مستقبل سے ہراساں ہو کر تمھیں نگل گیا۔

ٹیلر ماسٹر نے اُسے صبر کی تلقین کی۔

رشید کی ماں بے تحاشہ چیخیں مار رہی تھی۔ اور پاس پڑوس کی عورتوں کا دل اسلم کی باتیں سُن کر پھٹا جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ جنازے کو قبرستان کی طرف لے جا رہے تھے۔

پاگل جنازے کے آگے چل رہا تھا۔

گلی میں اونگھتے ہوئے آوارہ کُتے کا وجود ماحول سے برستی ہوئی ویرانی پر طنز کر رہا تھا۔

جب رشید کے بے جان جسم کو منوں مٹی کے نیچے سُلا دیا گیا تو

اسلم نے اپنی انگلی سے موٹے موٹے الفاظ میں لکھدیا۔

"یہ ایک رکشا والے کی قبر ہے"

ٹیلر ماسٹر نے پاگل سے کہا۔ چلو گارڈ صاحب۔ رشید کو آرام کرنے دو۔ پاگل افسردہ ہو رہا تھا۔ گارڈ اُسے کیسے اکیلا چھوڑ سکتا ہے۔ تمھاری دوستی ختم ہو گئی۔ اور میری دوستی کا اب آغاز ہوا ہے۔

واپسی پر اسلم سیدھا رشیدہ کے پاس چلا گیا۔ اُس روز وہ تمام دن اُس کی دل جوئی کرتا رہا۔ اور کرنل کی کیڈیلک گاڑی کوارٹر کے آگے کھڑی رہی۔ وہ اُس دن یہ بھی نہیں سوچ سکا کہ ایکسپریس مارکیٹ کے آخری موڑ پہ اٹیلا مارکونی اُس کا انتظار دیکھ رہی ہو گی۔

روشن نے اپنی ماں سے کہدیا تھا۔ وہ تین چار روز رشیدہ کے یہاں رہے گی۔

شام کے بڑھتے ہوئے سائے آسمان کے گوشوں پر کھوٹتی ہوئی شفق۔ اور ایمپریس مارکیٹ کے ٹاور کا مینار، جو زندگی کے ہر ہنگامے کو دیکھ رہا تھا۔ جس کی نظروں کے سامنے۔ آدمیوں کے ہجوم تھے۔ روشنیوں کے سیلاب تھے۔ اور ان گنت مناظر۔ ایمپریس مارکیٹ کے ٹاور کا بلند مینار۔ زندگی کی ایک ایک ادا کو گھور رہا تھا۔ بوڑھا مینار، بھی سبز نور آنکھوں سے ان مناظر کو دیکھتے دیکھتے، خود ایک خاموش داستان بن گیا تھا۔ اور ایمپریس مارکیٹ کے آخری موڑ پر اٹیلا ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی۔ اسلم کا انتظار دیکھ رہی تھی۔

ڈرائیور اسٹیرنگ پر جھکا ہوا اونگھ رہا تھا۔ دن بھر کی محنت، تعطل کے عارضی لمحوں کو فرصت جان کر اسے وقتی آرام پہنچا رہی تھی۔ اٹیلا پچھلی

سیٹ پر بیٹھی ہوئی ۔ کئی سگریٹ پھونک چکی تھی ۔ کار میں تمباکو کا دھواں بھرا ہوا تھا ۔ جس میں ایک کسیلی بو تھی ۔ اور گاڑی میں سگریٹ کے دھویں کا ہر چھلا ۔ اٹیلا کے اضطراب کا ایک غمناک لمحہ تھا ۔ طویل اور بے کیف انتظار کی افسردگی کا آئینہ دار ——— دھویں کا ہر چھلا ۔۔ سلگتے ہوئے ذہن کی غمازی کر رہا تھا ۔ انتظار کی طویل ساعتوں کو گذارنے کے لئے ۔ اُس نے دوبارہ سگریٹ جلا لیا ۔

اس کا ڈوبتا ہوا دل آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا ۔ اور اُس کی رنج ان گنت آدمیوں کے ہجوم میں اسلم کو تلاش کر رہی تھی ۔ اور اسلم بے کوارٹر کے کوارٹر میں بیٹھا ہوا رشیدہ کے آنسو پونچھ رہا تھا ۔ ایک جوان لاش کو قبر کی تنہائیوں تک پہنچا کر کسی گریاں وجود کو تسلی دے رہا تھا ۔ اور شام کے بڑھتے ہوئے جھٹ پٹے میں اٹیلا کے دل کا درد بڑھتا جا رہا تھا ۔

اپنے بارے میں جو اس کا فیصلہ تھا وہ بھی بڑا جذباتی تھا ——— انتظار کی ساعتیں گذارتے ہوئے پہلی مرتبہ اُس نے ذہنی اُلجھاؤ محسوس کیا ۔ دوسروں کی طرح وہ خود بھی اپنے بارے میں جذباتی ہونے کی رائے رکھتی تھی ایک انتہائی جذباتی عورت ۔ جس کی شخصیت کے ہر پہلو پر جذبات کی گہری چھاپ لگی ہوئی تھی ۔ جس نے ان جذبات کے سہارے کبھی جونی کو پیار کیا تھا ۔ اس کی زندگی کو سنوارا تھا ۔ اسے بلندیاں دی تھیں ۔ عزم دیا تھا ۔ اور جو پھر انہیں جذبات کے ایما پر اسلم سے پیار کر رہی تھی ۔۔ والہانہ پیار ——— جن کی نوعیت سمجھنے سے وہ خود بھی قاصر تھی ۔

ایک لمحہ کے لئے ماضی کی یادیں اُس کے حافظے میں اُبھرنے لگیں۔
اُس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔

اُس نے جونی سے پیار کیا تھا۔ سمندر کے کنارے دُور تک پھیلی ہوئی ریت کے سینے پر لکیریں بنائی تھیں اور مٹائی تھیں ـــ وقت کے فاصلوں کو احساس کے پیمانوں سے ناپا تھا۔ اور جب وہ ان فاصلوں سے گذر گئی۔ جونی اس کا ہو گیا تو ـــــ اُس کے آوارہ وجود کے متعفن لبادے میں ایک دوسرے وجود نے جنم لے لیا۔ ایک دوسری عورت پیدا ہو گئی۔ جو اس سے بھی زیادہ جذباتی تھی۔ پُراسرار تھی۔ مقدس تھی۔ جس نے ایک لمحہ میں اُس کی کایا پلٹ دی۔ جس نے جنس کی اتھلی نالیوں سے اُسے باہر نکال لیا۔ پھر اُس نے اس عجیب و غریب عورت کے ایما پر جونی کو کھو دیا۔ اپنے پیار کو کھو دیا ـ اپنی زندگی کے ایک اہم حصہ کو گنوا دیا۔ پھر تھوڑے دنوں بعد وہ عورت بھی مر گئی ـ حالات کی چتا نے اُس کے قالب کو پھونک دیا اور وقت کے جھونکوں نے اُس کی راکھ دور دور تک بکھیر دی ـــ

اب اُسے احساس ہو رہا تھا۔

اس عورت کو اُس کے غیر مرئی جذبات نے پیدا کیا تھا۔ نیچر کی اس کمزوری نے پیدا کیا تھا۔ جس میں اُس جیسی ہزاروں لڑکیاں گھری رہتی ہیں ـــ

وہ تھوڑی دیر کے لئے اسلم کو بھول گئی

اب جونی نہ معلوم کہاں ہوگا - حالات کے کون سے زنداں میں - وقت کے کون سے قفس میں -- وہ کہیں بھی ہو اب اُسے کیا - وہ دن ایک خواب بن چکے ہیں -- بھولے بسرے خواب -

آج وہ اپنے ساتھ انصاف کر رہی تھی -

اُس کا دل ایک لمحہ کے لئے سکڑا اور پھیل گیا - پاک خدا اُسے معاف کرے - اُس نے زندگی کو ٹھکرا دیا تھا - اپنے جذبات کے ساتھ ظلم کیا تھا -- پاک خدا -- عظیم ہے وہ ہر لغزش کو معاف کرسکتا ہے - اُس کا ذہن پھر اُلجھا - جونی کے بعد اُس کی زندگی میں کئی مرد آئے - گورے کالے، دبلے موٹے - امیر غریب، اُس نے ان سب کی راتوں کو رنگین کیا - گناہوں کی دستاویزوں پر دستخط کئے - قہقہے لگائے - اور پھر صبح ہوتے ہوتے ان پر کئی ہزار لعنتیں بھیجتی آگے بڑھ گئی - زندگی کا سفر اسی انداز میں طے ہوتا گیا - اس طویل عرصہ میں نہ تو اُسے کسی سے محبت ہوئی اور نہ اُس کے جذبات ہی کسی کی باتوں سے مانوس ہوئے - یہ سب جنس کے سیاہ کھیت کے آوارہ پنچھی تھے - جو اُس کے جسم پر منڈلاتے، اپنے سائے ڈالے - گوشت نوچا، فطرت کو ننگا کیا، اور اُڑ گئے - ان کے جانے کا نہ تو اُسے رنج ہوا اور نہ کبھی اُن کی یاد ہی آئی - اس اعتبار سے اُس کا ذہن بے شمار یادوں کا قبرستان تھا -

اڈیلا کی نظروں میں قبروں کی ویران قطاریں گھوم گئیں -

پھر ان قبروں میں احساس کے تاریک نہاں خانوں میں، لذت پرستی

کی ان سیڑھیوں پر اُس کی اسلم سے ملاقات ہو گئی ۔۔ ہنگامی ملاقات جو قدرے جذباتی انداز میں ہوئی ۔۔ اور پھر یہ ملاقات دونوں کی دوستی کا عنوان بن گئی۔

اسلم کا تصور اُس کے حواس پر چھا گیا

جونی کو اُس نے کھو دیا ۔۔۔۔ اب مدّت کے بعد ۔۔ اُسے ایک دوسرا جونی ملا ہے ۔۔ جس سے وہ والہانہ پیار کرنے پر مجبور ہے، جو اُس کے انگ انگ پر اپنا سایہ ڈال چکا ہے۔

اُس نے اپنے دل کو دوبارہ ٹٹولا

وہی جذبہ۔ وہی لگن ۔ وہی احساس۔ وہی بیتابی۔ جس کا اظہار اُس نے کئی مرتبہ جونی کے سامنے کیا تھا۔ اُسے اپنی زندگی پر جذبات کی گہری چھاپ لگی ہوئی نظر آئی ۔۔ اس کی روح چلائی۔ اسلم جونی ہے ۔ دوسرا جونی۔ جو روم کے بجائے کراچی میں اُسے ملا ہے۔ اور جسے وہ اب کبھی نہیں کھوئے گی۔ لیکن اس مرتبہ بھی اگر وہ عورت، ایک کمزوری بن کر اس میں بیدار ہو گئی تو۔ کیا وہ اسلم کو بھی اپنے ہاتھوں سے گنوا دے گی ۔۔؟ ہو سکتا ہے ۔ جیسے کسی نے اُس کے ذہن میں انگارے بھر دیئے ایک جیسا پیار ۔۔ ایک جیسا جذبہ ۔ ایک جیسی کیفیت ۔ ہو سکتا ہے ۔ ہو سکتا ہے ۔۔ ؟

وہ قریب قریب چیخ پڑی

ڈرائیور۔

ڈرائیور اپنی سیٹ پر اچھل پڑا ۔۔۔ یس میڈم
وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی
ٹیک می ڈیئر اپور یولانگ
ایمپریس مارکیٹ کے بلند ٹاور نے گھور کر جاتی ہوئی کار کو دیکھا ۔۔
اور پھر دیکھتا رہا ۔

روحوں میں غم کا زہر سرایت کر جائے تو جذبات کا ردِ عمل شدید ہو جاتا ہے۔

غم کے تین مختلف دائرے۔ جاگتی آنکھوں میں آنسوؤں کی علامت بنے ہوئے تھے۔ وہ تینوں رات بھر جاگتے رہے۔ ان کے دل دہشت زدہ تھے۔ رات بھر جاگنے سے روشن کا تھکا ہوا چہرہ، نیند کے تالاب میں ڈوبا ہوا کنول دکھائی دے رہا تھا۔ رشیدہ کی سوجی ہوئی آنکھیں اپنے جسم پر لگے ہوئے اس گھاؤ کو دیکھ رہی تھیں۔ جس کا مندمل ہونا اب بہت مشکل تھا۔

گلی کا آوارہ کتا، کسی اجنبی راہگیر پر بھونکا۔

روشن باورچی خانے میں چائے بنا رہی تھی۔ اسلم چارپائی پر بیٹھا

ہوا۔ سوئے ہوئے بیٹے کو دیکھ رہا تھا اور رشیدہ سوجی سوجی آنکھوں سے اس جگہ کو تک رہی تھی جہاں رشید کو آخری غسل دیا گیا تھا۔ پاگل قبرستان میں رات گذار کر ابھی ابھی واپس آیا تھا۔ اور اب وہ کمرے کے کچے فرش پر لیٹا ہوا۔ بڑبڑا رہا تھا۔

ہم جب تک بھی زندہ ہیں موت کا زہر ہمارے جسموں کو سُن کرتا رہے گا اور انسان کا نامکمل قبر نما سماج ہماری ہڈیوں سے اپنا پیٹ پالتا رہے گا۔

اس کے ذہن کو تکلیف دہ احساس کچوکے دے رہا تھا۔

مرجانے والا نہ تو فرشتہ سیرت تھا۔ اور نہ ایک کامیاب انسان، لیکن جب بھی اُس نے اُس کا دامن اٹھا کر دیکھا، اُس کی روح کی گہرائیوں میں جھانکا۔ اُس نے نہ تو کوئی گندگی دیکھی، اور نہ ریاکاری اُس کے پاس خلوص۔ دوستی۔ اور ہمدردی کا بے پناہ جذبہ تھا۔

تکلیف دہ احساس نے پہلو بدل کر اُس سے پوچھا

وہ ایک عظیم انسان تھا۔ بہت عظیم۔ جس نے تم سے دوستی کی، تمھارے پیٹ کے جہنم کو بھرا۔ تمھیں سہارا دیا۔

ٹھیک ہے۔ یہ سب ٹھیک ہے۔

مرنے والا بہت کچھ تھا۔ لیکن تم کیا ہو۔ جواب دو۔ تم اپنی سطح سے کتنے اونچے ہو سکتے ہو۔ تم اپنی ٹانگیں کب کرو گے۔ کرو گے بھی یا نامکمل وجود کا سڑا ہوا خمیر لیکچ پٹی میں لڑھکتے رہو گے۔ رشیدہ بے سہارا ہے۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھو۔ جو آج اپنے بھائی کی موت پر اشک بار ہیں!

لیکن ۔۔کل ۔۔۔ ہاں ہاں ۔ کل کا سورج طلوع تو ہوئے دو پہر یہ آنکھیں تمھارے انتظار میں اشک بار رہیں گی ۔۔ اور تم اٹیلا کے جسم کو اپنی آغوش میں سمیٹے جنس کے کیچڑ میں و ھنسے ہوتے ہوگے۔

باورچی خانے میں دھواں اُٹھ رہا تھا۔

اُس نے پھر رشیدہ کو دیکھا ۔ جس کی بے خواب آنکھوں میں آنسوؤں کے کئی طوفان کروٹیں لے رہے تھے ۔ اس نے بہت ہولے سے آواز دی

رشیدہ ۔۔۔

روشن نے باورچی خانے میں سے اسلم کو دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں

جی ۔۔ رشیدہ کی آواز میں درد تھا۔

وہ گھبرا سا گیا ۔ وہ کیا کہے ۔ پھر دل نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ۔۔ زبان پر آئے ہوئے الفاظ پھیل کر حافظے کی گود میں جا پڑے ۔ اُس نے بدقت کہا ۔

میں گاڑی واپس کر آؤں ۔

رشیدہ کے بجائے چولھے کے پاس سے روشن بولی ۔ جہاں کبھی جائیں چائے پی کر جانا ۔۔

پاگل طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا ۔ ابھی وہ کمرے کے فرش پر بیٹھا ہوا منہ ہی منہ میں بڑ بڑا رہا تھا ۔ اور پھر وہ اٹھکر بیٹھ گیا ۔ شاید اس کا دلوا نہ پن ۔ ہر سبق کی عملی تشکیل دیکھنے کا عادی تھا ۔ وہ حسب عادت چلایا ۔

وقت آچکا ہے کہ میں آسمانوں کی طرف پرواز کر جاؤں ..... حالات کی صلیب پر ایک بے گناہ انسان کے خون کا کفارہ میری رحمت کو جوش میں لا رہا ہے...... وہ بے ربط باتیں کر رہا تھا۔ بہت سے لوگ نہیں نہیں۔ ہزاروں۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں انسان ندامت کے آنسوؤں میں اپنے دامن بھگو کے رحمت کے دروازوں تک آگئے ہیں۔

منّا پاگل کی آواز سن کر جاگ اٹھا۔

پاگل کی آواز میں لرزش تھی۔ میں عنقریب آسمانوں کی طرف پرواز کر جاؤں گا۔ نیا روح القدس مصلوب ہو چکا ہے۔ اب نسل انسانی کے سر پہ نہ کوکانٹوں کا تاج ہوگا۔ اور نہ ماحول کے شکنجے میں ان کی ہڈیاں دہری ہو کر خون اور پیپ بہائیں گی۔

روشن چائے بنا کرلے آئی۔

اُس نے چائے کا کپ رشیدہ کو دینا چاہا

نہیں۔ رشیدہ غم واندوہ کا پیکر دکھائی دے رہی تھی۔

اسلم نے اصرار کیا۔ پی لو رشیدہ تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے

رشیدہ رونے لگی۔ میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔

منّا اٹھ کر رشیدہ سے لپٹ گیا۔ وہ آنسوؤں سے رونے لگی

اسلم ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اُس کی زبان پہ الفاظ کی آمد بہت سست تھی۔ میں جانتا ہوں رشید کی موت تمھارے

دل کے لئے ایک زخم ہے۔ جو ہمیشہ رستا رہے گا۔ وہ ایک اچھا بھائی تھا۔ عظیم دوست تھا۔ اُس کا اخلاص۔ ہم سب کو یاد رہے گا لیکن مرنے والے کے غم میں اس طرح رونا، اُس کی توہین ہے۔ اُس کی بہادری کی توہین ہے۔ وہ آخری سانس تک زندگی سے لڑتا رہا تھا۔ کبھی ایک لمحہ اُس نے حالات کے لشکروں سے شکست نہیں اٹھائی۔ وہ بلاشبہ بہادر تھا۔ ہمیں اُسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔ مرنے والوں کی رفاقت یہی ہو سکتی ہے کہ ہم اُنھیں یاد رکھیں اور اپنی زندگی کے مہلک ترین زخم چھپا کر مُسکراتے رہیں، اور اس کی یادوں کے چراغ کو بجھنے نہ دیں۔

رشیدہ غور سے اُس کی باتیں سُن رہی تھی۔ روشن منے کو اپنے ہاتھ سے چائے پلانے میں مصروف تھی۔

رشیدہ۔ اسلم بڑے خلوص سے کہہ رہا تھا۔ مرنے والے کو اب تمھارے آنسوؤں کی ضرورت نہیں ہے۔ آنسو، غم کی عظمتوں کو گھٹا دیتے ہیں۔ زندہ رہتے ہوئے زندگی کے تقاضوں کو پورا نہ کرنا۔ نامکمل انسان ہونے کی دلیل ہے۔ تم رشید کی بہن ہو۔ ایک عظیم انسان کی بہن۔ ایک محنت کش ہستی کی پالی ہوئی لڑکی۔ تمھیں تو بہادر ہونا چاہیئے۔ پھر اُس نے چائے کا کپ اُس کے ہاتھ میں دیدیا۔۔۔ تو پھر پی جاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔ مرنے والے کے نام پہ۔۔۔۔ غم کی اس عظمت کے نام پر۔۔ رشید کی مردہ ہستی کے لئے جو قابلِ قبول ہو۔

رشیدہ مان گئی۔ اُس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ روشن نے اُسے چائے کی دوسری پیالی دی۔ اسلم دزدیدہ نظروں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ گاڈ کمرے میں تھا۔ اُس کے اُترے ہوئے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ دھنسی ہوئی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اور ایک لاشعوری اضطرار، اُس کے روئیں روئیں سے پسینہ بن کر پھوٹ رہا تھا۔

جب وہ سب ناشتہ کر چکے تو اسلم جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

رشیدہ گلوگیر لہجے میں مخاطب ہوئی۔ آپ شام تک آجائیں گے۔

اسلم ہمدردی سے بولا۔ یقیناً۔ میں شام تک آجاؤں گا۔

روشن نے منے سے کہا۔ تمہیں کچھ منگانا ہے منے۔؟

منا بیچارگی سے اسلم کو دیکھنے لگا۔

اسلم نے جھپٹ کر اُسے اپنے سینہ سے لگا لیا۔ ہم منے کے لئے بہت سی مٹھائی لائیں گے۔

رشیدہ پھر آب دیدہ ہو گئی

پاگل ان سب کے درمیان آکر کھڑا ہو گیا۔ روشنی۔ پھر اندھیرا اور اب پھر روشنی۔ پھر وہ روشنی کے چاروں طرف ناچنے لگا۔ پہاڑ ہٹ گئے۔ بے گناہ کے خون کا کفارہ۔ بنی نوع انسان کو ابدی لعنتوں سے نجات دلا چکا ہے۔

اسلم چلا گیا۔ جاتی ہوئی موٹر دیکھ کر مدراسی خاندان کے بچوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ گلی کا کتا بھونکنے لگا۔ اور پاس پڑوس کے لوگ

اپنے اپنے کواٹروں کے کھڑکی نما روشندانوں سے جھانکنے لگے۔

دلی والی خالہ نے اپنی ہمسائی سے کہا۔ کیسی شاندار گاڑی تھی نہ معلوم کس کی ہوگی۔ کل سے دھوپ میں کھڑی تھی رنگ تک اُڑ گیا۔

ہمسائی کی آواز میں بھرپور طنز تھا۔ بھائی کی موت نے دروازے پر موٹر کی صورت تو دکھادی۔

دلی والی خالہ ہاتھ نچا نچا کر تبصرے کرتی رہی۔ اور اُس کی ہمسائی ان تبصروں کی افادیت پر ایمان لاتی رہی۔ غلیظ و پست ماحول میں پلنے والی عورتیں جس بیچارگی کی مجرم تھیں وہ پورے سماج میں کہیں نہیں تھی۔

روشن چائے کے برتن صاف کرکے کمرے میں آ گئی۔ رشیدہ نڈھال نڈھال چارپائی پر لیٹی تھی۔ پاگل اسد صحن میں بیٹھا ہوا زمین پر لکیریں بنا رہا تھا۔ اور منا اُسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

روشن اُس کے پاس بیٹھ گئی۔ اب کیسی طبیعت ہے؟

رشیدہ غم انگیز متانت کا مجسمہ دکھائی دے رہی تھی۔ ٹھیک ہے۔

تھوڑی دیر سو جاؤ۔

نیند تو اب مقدر سے اُڑ چکی ہے۔

روشن خود بھی رشیدہ کے برابر لیٹتے ہوئے بولی۔ کچھ دیر باتیں، روشن سنتی ہو۔ جذبات کا رچاؤ آواز بن کر کمرے میں بکھر گیا۔

روشن نے اُس کی طرف کروٹ لے لی۔ کیا ہے۔

اُس نے دیکھا۔ رشیدہ کسی خیال میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جیسے وہ بہت اہم بات کہنا چاہتی تھی۔ جب ہی تو وہ سوچ رہی تھی۔۔۔ تفکر کے آبگینوں کی ضو، اُس کے رخسار و دل کو جھو رہی تھی۔ وہ کیا اہم بات ہوگی۔ روشن کا دل دھڑکنے لگا۔

اُس نے روشن کو کچھ ہوئے سے پکارا۔ سنتی ہو۔؟

روشن جلدی سے بولی۔ ہاں کہو نا۔ کیا بات ہے؟

رشیدہ دبے دبے لہجے میں کہنے لگی۔ میرے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا چھا چکا ہے۔ وہ کہتے ہوئے خوف زدہ سی ہو رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔ ایسا سناٹا جسے اب سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہر شے خالی ہے۔ جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی پل پر سے گذرتے ہوتے کسی گہرے دریا میں جا پڑی ہے۔ اور ایک پُر شور دھماکے کے بعد چاروں طرف سناٹا چھا گیا ہے۔ وہ اور خوف زدہ ہوگئی۔ بجیا کی موت۔ میری موت ہے۔۔۔۔۔۔ میں جانتی ہوں میری روح میں خلا پیدا ہوگیا ہے اور اب یہ بڑھتا چلا جائے گا۔۔۔ وہ کہتے کہتے رک گئی۔ جو خلا رشیدہ کے اندر پیدا ہوگیا تھا۔ اُسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اور اُس نے کافی دیر تک اُسے بھرنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں ہزاروں خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی۔ مگر دوسرے ہی لمحہ وہ خیالات دماغ سے نکل جاتے تھے۔ بالکل چھلنی والا حساب

تھا۔ خلا ادھر پُر ہوتا تھا اور اُدھر خالی ہو جاتا تھا۔

پھر اُس نے اپنے آپ کو الفاظ میں ظاہر کرنا شروع کر دیا۔

روشن ۔ کھیا کی موت، میری موت ہے ۔ نہ معلوم کیوں میرا دل اندر سے چیختا ہے ۔ اسلم بابو کبھی میرے نہ ہوں گے ۔ یہ عجیب احساس کھیا کی موت کے بعد ہی میری موت کا پیش خیمہ بن کر مجھے تڑپا رہا ہے ۔ پھر وہ اٹھ بیٹھی ۔ میری بات سنو ۔ گاڈ صاحب بھی یہی کہتے ہیں ۔ میں جیتی ہوئی بازی ہار چکی ہوں ۔ تم مجھے اتنی عجیب نظروں سے نہ دیکھو ۔ میری باتوں پر اعتبار کرو ۔ گاڈ صاحب وہی کچھ کہتے آئے ہیں جو ہونے والا ہوتا ہے ۔ شاید انتہائی عقلمندی کا نام پاگل پن بھی ہو سکتا ہے ۔ تو روشن ۔ کوئی طاقت میرا دل پوری شدت سے کھینچ رہی ہے ۔ کوئی طاقت جیسے مجھے اندھیروں کی طرف لے جا رہی ہے ۔ جیسے کوئی ۔ نہیں ۔ خود میرے دل نے اب یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ اسلم بابو میرے نہ ہو سکیں گے ۔

اُس کی پلکیں بھیگ گئیں اور وہ سسکیاں لے کر رونے لگی

روشن ۔ میں تمھارا دکھ بھی سمجھتی ہوں ۔ عورت، دوسری عورت کے لئے آئینہ ہوتی ہے ۔ میں تمھارے چھپے ہوئے پیار کو دیکھ چکی ہوں ۔ اس درد کو دیکھ چکی ہوں ۔ جسے تم اپنے دل میں چھپائے ہو

روشن ندامت سے چلّا اٹھی ۔ رشیدہ بہن ۔

وہ کہتی رہی ۔

میری طرح تمھیں بھی اسلم بابو سے پیار ہے۔ ہم دونوں کے دل کی دھڑکنیں، ان کے کانوں سے ٹکرا چکی ہیں۔ وہ دونوں کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ کچھ سنتے ہوئے بولی۔ بھیا کی موت نے مجھے بہت سی حقیقتوں کے قریب کر دیا ہے۔ بعض اوقات کوئی غم انگیز حادثہ، ہمیں بہت سی ایسی باتیں سمجھا دیتا ہے جنھیں ہم سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اُس کی آنکھ سے بڑا سا آنسو ٹپک کر کرتے کے دامن میں جذب ہو گیا۔ ہاں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ کل میری آنکھوں پر جذبات کی نقاب پڑی تھی۔ میں نے اسلم بابو کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے اپنے تاثرات کا اندازہ نہیں لگایا تھا۔

پھر وہ بڑے پیار سے بولی۔ پگلی۔ بھیا اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن اُن کی یاد میری رہنمائی کر رہی ہے۔ اب میرے سامنے صحیح راستے ہیں۔ کوئی مجھے ان راستوں پر چلا رہا ہے۔ یہاں میرے وجود کا سلگتا ہوا سایہ کسی ویرانے میں پہنچ کر دم توڑ دے گا۔

روشن رونے لگی۔ ایسی باتیں مت کرو رشیدہ بہن۔

اُس نے جیسے کچھ بھی نہیں سُنا۔ اب میں اپنی آنکھوں سے بدلتے ہوئے حالات دیکھ رہی ہوں۔ اسلم بابو کو میں کبھی نہیں پا سکوں گی کبھی نہیں۔ بھیا کی موت میری موت ہے۔

پھر اس نے روشن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ مجھ سے

ایک بات کا وعدہ کرو۔

روشن نے بغیر سوچے سمجھے لاشعوری طور پر اپنی گردن ہلادی۔

تم اسلم بابو کو اپنانے میں کامیاب رہو گی۔ میں اس دنیا میں نہیں ہوں گی۔ اب میں جن دیرانوں میں سفر کر رہی ہوں۔ وہ بہت مختصر ہیں۔ تم میرے بعد منے کا خیال رکھنا۔ اور ہاں۔ ان ناکامیوں سے گھبرا کر۔ نہ تو تم ہمت ہارنا۔ اور نہ شکست قبول کرنا۔ وہ دن بہت قریب ہیں۔ جب بابو کو میری ضرورت ہوگی۔ میرے پیار کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اس وقت تک میں بھیا کے پہلو میں چین کی نیند سو چکی ہوں گی۔ آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔ وہ آپ ہی آپ کہے جا رہی تھی۔ روشن۔ تم سن رہی ہو نا۔ ایک دن بابو بلندیوں کو چھوڑ کر ان ہی پستیوں کی طرف لوٹیں گے۔ اس سچائی کی طرف۔ اس وقت میری یاد کا سہارا لے کر تم انھیں اپنا لینا۔

اس نے روتی ہوئی روشن کو اپنی باہوں میں کھینچ لیا۔ پھر اس کا منہ چومتے ہوئے کہنے لگی۔ بھیا کی موت کے غم انگیز سانحہ کے بعد بھی میں کتنی خوش ہوں۔ آج میں تمھیں اپنا سب کچھ دے رہی ہوں۔ کسی جلن۔ حسد یا نفرت کے جذبات کے تحت نہیں۔ بلکہ حقیقتوں کا اشا۔ اپاکر ۔۔۔

وہ غایت درجہ جذباتی ہو رہی تھی ۔۔۔ روشن اتنی باتیں سننے کے بعد ذہنی اعتبار سے سُن سی ہو گئی تھی۔ اور رشیدہ کی عرق آلود

پیشانی لوہے کے گرم ٹکڑے کی طرح تپ رہی تھی۔ اُس کا جسم جلنا شروع ہو گیا۔

روشن نے اُس سے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔ تمہیں بخار ہو گیا ہے۔

وہ آنچل میں اپنا منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

روشن کو محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اُس کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رشیدہ نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ لیکن اس رہائی کے بعد کی فضائیں کبھی گھٹی گھٹی ہیں۔

کوارٹر کے کمرے کی نما روشن دان سے گذر کر دھوپ کچے فرش پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور روشن رشیدہ کے کانپتے ہوئے جسم پر جھکی ہوئی اُس کے آنسو اپنے آنچل سے خشک کر رہی تھی۔

لوہے کی زنگ خوردہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے چائے کا ایک بڑا سا پیالہ پی کر پہلے اُس نے ڈکار لی۔ پھر مونچھوں کو منہ میں دبا کر اُنھیں چوستے ہوئے اُس نے جمن سے پوچھا۔ روشن کہاں ہے؟

جمن اپنے رشتے کے بھائی کے آنے سے نہال ہو رہی تھی۔ وہ بڑے انداز سے بولی۔ روشن ابھی آئے جاتی ہے۔ رشتے کے بھائی کی بیوی۔ ہرے سرخ کپڑے پہنے پان چبا رہی تھی۔

جمن نے اپنی بھاوج سے کہا۔ تیرا لڑکا کہاں ہے؟

بھاوج نے پان کی پیک فرش پر تھوک دی۔ باہر کھڑا ہے۔

جمن مصنوعی غصہ سے بولی۔ تیرا خانہ خراب لونڈے کو اندر کیوں نہیں بلاتی۔ پھر اُس نے خود ہی اُٹھ کر اپنے رشتے کے بھائی کے

لڑکے فضلو کو آواز دے لی۔ فضلو بے ہنگم طریقے پر شرماتا ہوا۔ کرے میں چارپائی پر آ بیٹھا۔

جمن کا بھائی اپنی مونچھوں پر بل دے کر بولا۔ دیکھ لے میرے لونڈے کو۔ ایمان قسم! کیسا جوڑ رہے گا۔ ساری برادری جھوم اُٹھے گی۔

بھاوج کی باچھیں کھل گئیں۔ سچ تو کہتے ہیں تیرے بھیا۔ وہ جمن کو سمجھانے کے انداز میں بولی۔ مٹھائی ہم ساتھ لائے ہیں آج مانگ پکی ہوجانا چاہیے۔

جمن بھیانی۔ مانگ تو پکی ہے۔ پر لڑکا پہلے نوکر ہو لے۔

لڑکا نوکرا ابھی نہیں ہے تو کیا ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ جمن کا بھائی اپنے لڑکے کی نوکری کے مسئلہ پر زیادہ بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی میں جو زندہ ہوں۔ تیری روشن راج کرے گی۔ راج' وہ اپنے فقروں پر زور دے کر بول رہا تھا۔ تو جو کہے گی' میں وہ سب پورا کروں گا۔ پر آج میرے لونڈے کے سر پر ہاتھ رکھ دے

جمن نے بھائی کے تیور سمجھ کر نوکری کے مسئلہ پر زیادہ باتیں نہیں کیں۔

روشن ابھی نہیں آئی۔

بس آتی ہوگی بھیا

پھپھو۔ تیرا گھر تو خوب ہے۔ روشن کا منگیتر پہلی مرتبہ بولا۔

جمن بزرگانہ انداز میں بولی - تیرا ہی گھر ہے بٹیا

پھر دروازہ کھلا اور روشن آگئی - جھومتا ہوا سلونا جسم - تیکھے نقوش اور نیند کے ساگر میں ڈوبی ہوئی کنول جیسی آنکھیں - جن میں آنسوؤں کے کئی طوفان ابھی تک انگڑائیاں لے رہے تھے -

روشن نے اپنے ماموں اور ممانی کو سلام کیا -

جیتی رہو بیٹی - اُس کا ماموں اُسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا

روشن کا لہجہ خشک تھا - کیوں بلایا ہے ماں ؟

جمن سٹپٹائی - تیرا ماموں آیا ہے -

روشن کی ممانی جگالی کرتے ہوئے کہنے لگی - اب تیری مانگ پکی ہو چکی ہے -

وہ چونک سی گئی - کس کی مانگ -

جمن نے اس پر اپنے مصنوعی غصہ کا اظہار کیا - تجھے کیا ہے لڑکی جا اپنا کام کر -

روشن متانت سے بولی - نہیں ماں - اب مجھے کوئی کام نہیں ہے

پھر وہ اپنے ماموں سے مخاطب ہو کر بولی - تیری جان کی قسم ماموں میری ماں تو سٹھیا گئی ہے - وہ میرا ہاتھ ایسے لڑکے کے ہاتھ میں دینا چاہتی ہے جو پڑا پڑا چار پائی توڑتا رہتا ہے -

ماموں اور ممانی کے کانوں میں اُس کے کہے ہوئے الفاظ بم کے گولے کی طرح پھٹے -

روشن کا منگیتر گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر تیزی سے بیٹھ گیا۔

جمن اپنا سر پیٹنے کی تیاری کر رہی تھی۔

روشن کے ذہن میں انتقام کے نئے نئے طریقہ آ رہے تھے۔ تیری جان کی قسم ماموں۔ تیری مونچھیں کس قدر شاندار ہیں۔ تو تو پورا ڈاکو دکھائی دیتا ہے۔ اور آج شاید ڈاکہ مارنے ہی بہن کے گھر آیا تھا۔ مال نہ سہی۔ اس کی لڑکی ہی سہی۔ تو جانتا ہے نا۔ نکھٹو لڑکے کے لئے ایسی عورت چاہیئے جو ساری عمر اس کا پیٹ بھر سکے جو اپنے پوری سسرال کو روٹی کما کر کھلا سکے۔

ممانی اور ماموں کو اپنے جسم میں سوئیاں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

روشن کھڑی ہو گئی۔ تجھے میری صورت بہت پسند ہے۔ اور ممانی تو مجھ پر فدا پڑی ہے۔ لیکن کل یہی صورت فاقے کرتے کرتے کیسی ہو جائے گی۔ تجھے خبر ہے۔ تو نہیں جانتا۔ لے میں بتاتی ہوں۔ وہ آئینہ اٹھا کر ماموں کے سامنے لے آئی۔ یہ صورت۔ بالکل تیرے مردار چہرے کی طرح ہو جائے گی۔

جمن نے بڑی زور سے ہائے کا نعرہ لگایا۔ تیرا ستیاناس ہو۔ کمبخت۔ چڑیل۔

وہ ماں کی طرف پلٹی۔ اور تو ماں، اپنی کوکھ کی آگ کو خود بجھانے پر تلی ہوئی ہے۔ تو خود اپنی ممتا کی دشمن ہے۔ ایسی ہی دشمن۔

جیسے میں اپنے ماموں کی مونچھوں کی دشمن ہوں۔ روشن کا لہجہ تیز ہو گیا۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔

جمن اپنا سینہ پیٹتے ہوئے چلائی ۔ میری آنکھوں سے دور ہو جا ڈائن ـــ

وہ تیزی سے اپنے پاؤں پٹکتی ہوئی رشیدہ کے کواٹر کی طرف چلی گئی ۔ رشیدہ ابھی تک سو رہی تھی ۔ اور جب وہ چارپائی پر بیٹھ گئی تو اُسے احساس ہوا۔ اُس کے چاروں طرف بھی ایک ہولناک سناٹا چھاتا جا رہا ہے ۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُس کے ہر آنسو میں اسلم کی صورت جھلملا رہی تھی ۔ پھر یہ صورت اور واضح ہو گئی ۔ وہ دل ہی دل میں اس صورت سے کہتی رہی ۔ میں تمھاری ہوں ـــ ہاں ہاں ـــ میں تمھاری ہوں ۔ نہ جانے احساس کی غمناک نیرنگی کا یہ عالم کب تک رہا ۔ اور پھر وہ سو گئی ۔ تھکے ہوئے جذبات شعور کے ان دیکھے گہواروں میں جھولتے جھولتے سو گئے ۔

بڑی دیر بعد اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا ۔ رشیدہ جاگ چکی تھی ۔ اور پاگل اُس کے سامنے یوں بیٹھا ہوا تھا ، جیسے جلی ہوئی بیڑی کا بودا سا ٹکڑا ۔ اُس نے رشیدہ کو کچھ بھی نہیں بتایا ۔ وہ بغیر کچھ کہے اپنے کواٹر گئی ۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا ۔ اُس کی ماں بھی اپنے رشتے کے بھائی کے ساتھ جا چکی تھی ۔ روشن نے روتے ہوئے اپنے کواٹر میں تالا ڈال دیا ۔

ہیچ لکژری کے منیجر نے کاروبارانہ تبسم کے ساتھ اسلم کا استقبال کیا۔

کرنل قصار۔ ٹھیک دو بجے تشریف لائیں گے۔ آپ انتظار کر سکتے ہیں۔؟

اسلم بے دلی سے بولا۔ مجھے اُن کی گاڑی واپس کرنا تھی۔

منیجر نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ کوئی بات نہیں۔ گاڑی آپ چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ پھر وہ بڑے سے رجسٹر پر جھک کر اپنا قلم چلانے لگا۔

اسلم مطمئن ہوگیا۔ بہت بہت شکریہ۔ نوازش۔ اس نے کاؤنٹر پر موٹر کی چابی رکھ دی۔ کرنل سے میرا سلام کہہ دینا۔ وہ جانے کے لئے مڑا۔ دیتے

میں ان سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے قدموں کی آواز ہال میں پھیلی اور پھیلتی چلی گئی۔

اسلم پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتا رہا۔ ہوٹل کی پرشکوہ عمارت بہت پیچھے رہ چکی تھی۔ زندگی کے ہنگاموں سے معمور شاہ راہیں، بے نام فاصلوں کا اعلان کرتے ہوئے دور تک چلی گئی تھیں۔ اور سڑکوں کے کنارے چھوٹے چھوٹے دوکان دار اپنی دوکانیں سجائے اطمینان سے بیٹھے گھٹیا سگریٹیں پھونک رہے تھے۔ سڑک کے دوسرے کنارے ایک پولیس والا۔ کسی خوانچہ فروش کا چالان لکھنے میں مصروف تھا۔ اس نے چلتے چلتے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ وہ بجھا بجھا ماحول۔ دھواں دھواں فضا۔ تھکی تھکی زندگی۔ اور وقت کی پلکوں پر ٹھہرا ہوا۔ غم و اندوہ کا آنسو۔ اسلم نے ٹھنڈی سانس بھری۔ زندگی کی تلخیوں میں گھرے ہوئے۔ ان گنت روتے بسورتے چہرے۔ آلام کی تیز دھوپ میں جلتے ہوئے جسم۔ اور چرمراتی ہوئی ہڈیوں کے انبار۔ شاید یہی ہمارا سرمایہ ہیں۔ عظیم سرمایہ۔ جو ہمارے چاروں طرف بکھرا ہوا ہے۔ جو ہمیں بے تحاشہ دیا گیا ہے۔ فطرت کتنی فیاض ہے۔ اُمید سے کہیں زیادہ فیاض۔ اس نے دل ہی دل میں نیلے آسمان پر رہنے والی فیاض فطرت کا شکریہ ادا کیا۔

سڑک کے دوسرے کنارے پولیس کا سپاہی خوانچہ فروش کا چالان مرتب کر کے سامنے کے ہوٹل میں گھسا ہوا چائے پی رہا تھا۔

اور خوانچہ فروش اپنے دوسرے ساتھی سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا
نیچ لکڑری کے بوڑھے مینجر کو کرنل کی گاڑی واپس کرنے کے
بعد وہ سوچ رہا تھا۔ کم از کم اُسے کرنل سے مل کر شکریہ تو ادا کرنا چاہیے
تھا ___ کرنل نے اُس کے ساتھ ہمدردی کی تھی۔ ایسی ہمدردی۔
اونچے طبقہ میں جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

اونچا طبقہ

اُس نے بُرا سا منہ بنایا۔ وہ ایسی گھٹیا باتیں آخر سوچ ہی
کیوں رہا ہے۔ دنیا میں نہ تو کوئی اونچا طبقہ ہے اور نہ نیچا۔ انسانیت
کی یہ تقسیم، کسی معاشرتی اصول کی بنا پر تو نہیں ہے۔ جو مفکر یہ
کہتے ہے۔ انسانیت تقسیم ہے۔ انسان مختلف حصوں میں بٹے ہوئے
ہیں۔ وہ بڑے چغد ہیں۔ انسانیت کی اکائی کبھی تقسیم نہیں ہو سکتی ہے
انسانیت کے اتحاد کو کوئی پارہ پارہ نہیں کر سکتا ہے۔

اب وہ ایمپریس مارکیٹ جانے والی سڑک پر چل رہا تھا۔
رشید کی موت کا تلخ حادثہ ابھی اُس کے ذہن میں ماتم رسے کی طرح
دہک رہا تھا۔ اب رشید اس دنیا میں نہیں تھا۔ لیکن اُس کی بے رحم
یاد ایک کراہ بن کر اُس کے دل میں گھٹی ہوئی تھی۔ یادیں کتنی بے رحم
ہوتی ہیں۔ یہ آنسوؤں میں بھی جھلملاتی ہیں۔ اور ٹھنڈی آہوں کے
زہریلی دھویں کی چادر اوڑھ کر رفاقت کے پیمان بھی پورے کرتی ہیں'
اب رشید، ہمیشہ اُسے یاد آتا رہے گا۔ ہمیشہ۔ اُس کی زندگی کی

آخیر ساعتوں تک ——— کسی کو یاد کرنا تو چھندپن نہیں؟

وہ بڑی دیر تک چلنے کے بعد اب امپریس مارکیٹ کے موڑ پر کھڑا تھا۔ بغیر کسی مقصد کے۔ سامنے پارسی کالونی تھی۔ جس کی بلند عمارتیں آسمان کی ہمراز معلوم ہو رہی تھیں۔ اُجلے اُجلے فلیٹ، جن کی کھڑکیوں پر مختلف رنگوں کے پردے پڑے ہوئے رومان انگیز فضا کو جنم دے رہے تھے۔ ایسی فضا جو انتہائی شراب آور ہوتی ہے۔ جو دل و دماغ پر ایک غنودگی بن کر چھا جاتی ہے اور جس کے گہوارے میں جھول کر الھڑ جوانیاں، قیامتوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ پُر اسرار گھر سے۔ اور گھروں کی کھڑکیوں پر پڑے ہوئے رنگین پردے۔ اُس کے قریب ہی ایک عجیب سا شور ہو رہا تھا۔

حلوے پوری کی دکان پر گاہکوں کا ہجوم، اپنے پیٹ کے دوزخ کو بجھانے میں مصروف تھا۔

"ایک پاؤ پراٹھا۔"

"آدھ سیر حلوا۔"

"سات پوری۔"

چھ آنے۔

آگے والا بابو بارہ آنے۔

تین آنے۔

اُس نے پلٹ کر دیکھا، ایک میلا کچیلا لڑکا، حیرت انگیز طور پر

اپنی یادداشت کے سہارے آواز میں لگا رہا تھا۔

ایک روپیہ چار آنہ

وہ بے دلی سے مسکرا دیا۔ تین۔ اسپیشل ہاف سیٹ چائے۔

بیرے کو جیسے یقین نہیں آیا۔ دو گلاس پانی

اسپیشل ہاف سیٹ چائے

برابر والی میز کے داہنی طرف، بلیک مارکیٹر بیٹھے اپنی قسمت کو رو رہے تھے۔

مارشل لا کے بعد گھاٹا ہی گھاٹا چلا آ رہا ہے۔ سالا اپن اب تجارت ہی نہیں کرے گا۔ بلیک نہیں تو تجارت نہیں۔

آج وہ بہت غور اور دلچسپی سے ان سب کی باتیں سُن رہا تھا اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سب اُس کی اپنی مختلف پرچھائیاں ہیں۔ جو پورے سماج میں پھیل گئی ہیں۔ یہ وہ بھرپور زندگی ہے جو کسی حال میں قابلِ نفرت نہیں ہو سکتی۔

بیرے تیزی سے اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔

ہوٹل کے باہر دروازے سے لگا ہوا وہی بوڑھا فقیر کھڑا تھا۔ اُس نے سوچا آج وہ بھی اس فقیر سے سٹے کا نمبر پوچھے گا ——————

سڑکوں پر روشنیاں تھیں

بیرے نے چائے کا سامان اُس کے سامنے لگا دیا

وہ خاموشی سے چائے پیتا رہا۔

اسلم نے چائے پیتے ہوئے سوچا۔

کرنل۔ سان فرانسسکو کے شراب خانوں میں بیٹھا اپنی سچائی کی تکمیل کر رہا ہوگا۔ اس کے حصے میں جو زندگی آئی ہے۔ وہ اس کے سماجی نقطۂ نظر سے ایک برہنہ گالی تھی۔ عظیم ترین سکینڈل۔ اور فسادات بھی روکس کے بنے ہوئے ساغروں کے افق سے کبھی سچائی کی کرن نہیں پھوٹ سکتی۔ سچائی ہمیشہ سماج کے نچلے اور تاریک نہاں خانوں میں جنم لیتی ہے۔ مگر پھر بھی وہ پورے خلوص سے اپنے ماحول کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اس کی محبت میں ریاکاری نہیں ہے کھوکھلا پن ضرور ہے اور یہ کھوکھلا پن اسے اس معاشرے نے دیا ہے۔ جس کا وجود پیاز کے بدبودار چھلکوں کے گلے سڑے ڈھیر کی طرح ایک عالمگیر متلی اور کڑواہٹ کا خالق بنا ہوا ہے۔ وہ چائے پیتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

جن راہوں پر وہ سفر کرے گا۔ وہاں جولینا۔ عائشہ۔ بی گل افریدی بیگم فصاحت یار جنگ اور اٹیلا کی جذباتی پیار کی "ڈولتی چاندنی" نہ ہوگی۔ حق نواز کا کاٹھیاواڑی چہرہ بھی نہ ہوگا۔ جن راستوں سے وہ گذرے گا اس کا دل اچھل کر پھر معمول پر آگیا۔ وہاں رشیدہ کا پیار۔ اور روشن کا خلوص ہوگا۔ اس نے پہلی مرتبہ۔ رشیدہ کو پورے خلوص سے یاد کیا۔

دکان کا ماحول اسے سرے سے گنجا نظر آیا۔ اور اس دکان میں اپنا پیٹ بھرنے والے چور ——، جو اپنی بیویوں سے چھپوا ن مزے لے لے کر سستی مٹھاس کے نوالے جلدی جلدی اپنے حلق میں انڈیل

رہے تھے۔ اور جن کی بیویاں ابھی تک گھروں میں بیٹھی ہوئی اونگھ رہی ہوں گی یا اپنی ہمسائی سے قرض آٹا لے کر روٹیاں پکا رہی ہوں گی۔

پارسی کالونی کی پہلی عمارت کے درمیانی فلیٹ کی بالکونی پر ایک لڑکی کا سایہ کھڑا ہوا اُسے گھور رہا تھا۔ اُس نے ماحول کی بوریت سے بے نیاز ہو کر سوچا۔ کل اسی جگہ اٹیلا نے میرا انتظار دیکھا ہوگا ایک کمزور فطرت نرم جذباتی لڑکی۔ کل یہاں میرا انتظار دیکھ رہی ہوگی۔ شام کے گہرے سائے لہرانے سے پہلے تک وہ پُر امید ہوگی اُس کے جذبات پُرامید ہوں گے۔ وہ جانتی ہوگی میرا آنا یقینی ہے اور جب شام کے گہرے سایوں نے ٹاور کے بلند مینار کو چھوا ہوگا اُس وقت اس کی اُمید نے دم توڑ دیا ہوگا۔ اُس کے جذبات ایک ایک کر کے سرد ہو گئے ہوں گے۔ وہ نڈھال ہو گئی ہوگی۔ اُمید کا آئینہ جب ٹوٹتا ہے تو اُس کی کرچیاں روح تک کو زخمی کر دیتی ہیں۔ فضا میں زخمی روح کی پکار بکھرنے سے پہلے۔ اُس کے دل کی دھڑکنوں میں فرق آگیا ہوگا...... اور پھر وہ لوٹتے ہوئے دل، اور پیاسی تمناؤں کا ماتم کرتی چلی گئی ہوگی۔

جیکب لائنز، دو آنے سواری۔ اُس کے قریب سے گذرتے ہوئے رکشا والے نے آواز لگائی۔

اٹیلا کو میرا انتظار ہوگا۔ کل وہ میری منتظر ہوگی۔ انتظار۔

انتظار ......۔ اس کی روح جیسے چلّائی۔ ہم سب اس اذیت ناک تکلیف کے اسیر ہیں۔ ہم سب کو کسی نہ کسی کا انتظار رہتا ہے۔ اور اب رشیدہ بھی تو تمھارا انتظار دیکھ رہی ہوگی۔

فضا اُس سے سرگوشی کرتی ہوئی دکھائی دی۔

رشیدہ — رشیدہ —

جو اب انتظار کی آگ میں جل رہی ہوگی۔ جو اب تمھارا انتظار کرے گی۔

ہلو مسٹر اسلم

نسوانی آواز سن کر وہ چونک اٹھا۔ ہلو۔ اوہ۔ مس جولینا

وہ متحیر سا ہو رہا تھا۔ آپ یہاں کہاں ؟

جولینا نے سامنے والی بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ درمیان کا فلیٹ میرا ہے۔ آپ بہت دیر سے یہاں کھڑے ہیں —

اسلم قدرے تکلف سے بولا۔ آپ کی بلڈنگ شاید جام جہاں نما ہے۔

جولینا مترنم آواز میں بولی۔ بلڈنگ نہ سہی۔ لیکن وہ سامنے والی بالکنی ضرور جام جہاں نما ہے۔

اسلم نے جولینا کو گھور کر دیکھا۔ تو وہ ننھا سا کیف بار سا یہ آپ کے وجود پر مشتمل تھا۔

جولینا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ۔ چلئے نا ۔ یا کسی کا انتظار ہو رہا ہے ۔

آپ نے کیسے جانا ؟

یہ آپ کے کھوئے کھوئے انداز ۔ بھٹکتی ہوئی نظریں ۔

اسلم نے بات کاٹ دی ۔ جن میں پیاس ہے ۔ اضطراب ہے ۔ آنسوؤں کی جلن اور کسی کو دیکھ لینے کی تمنا کروٹیں لے رہی ہے ۔ ٹھیک ہے نا ۔

جولینا ہنس دی ۔ آپ ایک آئیڈل انسان ہیں ۔

اور آپ کسی شاعر کا خواب ، فردوسی کی فکر ۔ ایران کی مسکراتی ہوئی سحر خیام کی سب سے حسین رباعی ۔ اگر آپ اٹیلا سے پہلے ملتیں تو ۔۔

شٹ اپ ۔ جولینا اترا کر بولی ۔ اگر یہاں اسی طرح باتیں ہوئیں تو آدمیوں کا مجمع لگ جائے گا ۔

پھر میں دوائیں بیچنا شروع کر دوں گا ۔

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے چل دیئے ۔ جولینا مسکرا مسکرا کے اٹیلا کی باتیں سُنا رہی تھی ۔ کل وہ بیچاری بہت بور ہوئی ۔ تم تو آئے نہیں ۔ بات بات پر لڑتی تھی ۔ پھر وہ اسلم سے پلٹ کر کہنے لگی ۔۔ میں تکلف کو پسند نہیں کرتی ہوں ۔ بتاؤ نا یہ تمھاری کون سی ادا تھی ۔۔؟

ایک بے نام ادا

جولینا سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولی۔ اس بے نام ادا کی سزا۔

جولینا کی معرفت اٹیلا سے ملاقات۔

اُس کا نقرئی قہقہہ سیڑھیوں پر گونجا۔ منظور ہے۔

وہ دونوں کمرے میں داخل ہو گئے۔

وہی رومان انگیز فضا۔ جیسے کوئی پریوں کے دیس سے چُرا کر ان کمروں میں بکھیر دیتا ہے۔

جولینا اپنی دُھن میں تھی۔ آپ بیٹھیں۔

مختصر سا کمرہ سلیقہ سے آراستہ تھا۔ ایک بڑے سے اسٹینڈ پر شہنشاہ ایران کی قد آدم تصویر رکھی ہوئی تھی

اسلم نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ کس تقریب میں یہاں تشریف لائے ہیں؟

یہ میرے بھائی کی پینٹنگ ہے۔ وہ ایسی ہی اوٹ پٹانگ تصویریں بناتا ہے۔

اسلم کے لہجہ میں اضطراب تھا۔ کیا اٹیلا سے ملاقات ممکن ہے

جولینا اپنے فراک کے دامن سے کھیلتے ہوئے بولی۔ ضرور۔ ٹھیک دس بجے وہ یہاں آئے گی۔ آج اُس نے آفس سے چھٹی لے لی ہے۔

میں تمھارا ممنون رہوں گا۔

تم چائے پینا پسند کرو گے یا کافی۔؟

کافی بہت تیز۔

جولینا جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ چند منٹ کی مہارت۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی چلی گئی۔

وہ اٹیلا سے معافی مانگ لے گا۔

وہ اٹیلا کو اس حادثے کے بارے میں بتائے گا۔

گریاں روح کی فریاد، وہ سُن سکے گی

رشید کی موت، حادثہ

قدموں کی چاپ اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔ کوئی سیڑھیاں عبور کر رہا تھا۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔ معاً اُس نے اپنے ذہنی رجحانات کو ٹٹولا۔ گذشتہ دنوں کی اس ساری ہنگامہ پرور اور ہیجان آمیز جذباتی فضا کو بھلا کر۔ اور ان سارے تصورات کو الگ کر کے جو اس کی ذات کے ساتھ مستقل طور پر وابستہ ہوتے جا رہے تھے۔ اُس نے چند لمحوں میں جذباتی معمولات کا تجزیہ کرنا چاہا آخر اٹیلا میں کیا ایسی بات ہے جس نے اُس کو اتنا وارفتہ بنا رکھا ہے۔

قدموں کی چاپ اور قریب آگئی

ان باتوں کو سوچا نہیں جا سکتا۔ اس کا جواب اٹیلا اُسے دے سکے گی۔۔۔۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اٹیلا، ایک زخم خوردہ پرندے کی طرح اُسے نظر آئی۔ وہ دروازے پر آویزاں پردے کو

پکڑے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

وہ گھبرا گیا۔ اٹیلا۔ وہ میرا رفیق تھا۔ غم گسار تھا۔ دوست تھا۔ کل جب تم میرا انتظار دیکھ رہی تھیں۔ اُس وقت میں اُسے قبر کی گہرائیوں میں سُلا رہا تھا۔ اس نوعیت سے میرے دوست کی موت کا غم۔ ایک ذاتی غم ہے۔ وہ ایک ہی سانس میں بولتا رہا۔ انھی کے ساتھ وہ گنتی کے رکشا چلانے والوں میں سے تھا جس کی اپنی ایک انفرادیت تھی۔ میرے شہر کی سڑکیں اُسے بھول جائیں۔ لیکن میں مدتوں اُسے یاد کر کے روتا رہوں گا۔

اُس کی آواز بھرا چکی تھی۔ اور وہ صوفے پر گر چکا تھا۔ بالکل ایک بے جان لاش کی طرح، اٹیلا اُس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنا سر اُس کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ مجھے معاف کر دو۔ اٹیلا کی پلکوں پر آنسو لرزنے لگے، مرنے والے کا احترام، میں پورے خلوص سے کروں گی۔

اسلم کے آنسو ڈھلک ڈھلک کر قالین میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

اٹیلا گلوگیر لہجے میں بولی۔ ہماری دعائیں اس کے لئے وقف رہیں گی۔

میں تم سے شرمندہ ہوں۔ کل تم پریشان رہیں۔

میری پریشانی کے احساس سے زیادہ ایک اور بھی احساس

کی دنیا ہے۔ جہاں تمھارے گذارے ہوئے المناک لمحے، مرنے والے دوست کی روح کو تسکین پہنچا۔ رہے ہوں گے۔

اسلم نے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔

انجیلا تڑپ اٹھی۔ تم میرے جذبات کے لئے سنگین سزا بن گئے ہو۔ جس کی نوعیت سمجھنے سے میں قاصر ہوں تم مجھے جذباتی عورت کہہ سکتے ہو۔ وہ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے بولی۔ ابھی میں تم سے پیار کر رہی ہوں۔ والہانہ پیار۔ تمھاری بانہوں کا لمس۔ مجھے گہری نیند میں مبتلا کئے ہے۔ لیکن میں اُس وقت سے ڈرتی ہوں۔ جب یہ نیند ٹوٹ جائے گی۔ اور مجھے تم سے جدا ہونا پڑے گا تم مجھے شوٹ کر دو۔ تاکہ ان لمحوں کو موت ابد کے سانچوں میں ڈھال دے۔ وہ اسلم سے بے تحاشہ لپٹ گئی۔ پھر وہ تھکے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔ تم مجھے شوٹ کر دو۔ یہ میری سب سے بڑی آرزو ہے۔ اگر یہ کیفیت جاتی رہی تو میرا آوارہ وجود۔ پھر گناہوں کی ٹھوکروں میں لذت محسوس کرنا شروع کر دے گا۔

لیکن ایسا ہو گا کیوں۔؟

میں خود نہیں جانتی۔ مگر ہر بار یہی کچھ ہوا ہے۔ تھوڑے دنوں بعد مجھ میں ایک اور عورت بیدار ہو جائے گی۔ جو عجیب فیصلے کرنے کی عادی ہے۔ مجھے اس عورت سے خوف آتا ہے۔ بس تم مجھے

قتل کردو۔ میں تمھارے دل کی دھڑکنیں سنتے ہوئے مرجانا چاہتی ہوں ___

اسلم ہنس دیا۔ میں تمھیں نہیں اس عورت کو ضرور قتل کردوں گا۔

انٹیلا ایک دم کھڑی ہوگئی۔ چلو چلیں۔

جولینا کافی لینے گئی ہے ___۔

وہ تنہائی میں کافی پینا زیادہ پسند کرے گی۔

ان کے قدموں کی چاپ خاموش کمرے میں بیٹھ گئی۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کا سہارا لئے سیڑھیاں اُتر گئے۔ اور جب وہ چلے گئے تو جولینا نے پردے کی آڑ سے نکل کر دروازہ بند کرلیا۔

رشیدہ کی موت۔ گلی کے دوسرے کونے والوں کے لئے ایک بھولا بسرا خواب بنتی جا رہی تھی۔ ٹیلر ماسٹر اب دن میں کئی مرتبہ تسلی دینے کے بجائے دکان سے واپسی پر رشیدہ کو تسلی دینے آتا تھا۔ مدراسی خاندان اور اس کے بے ہنگم بچے، بے لاتعلق سے ہوتے جا رہے تھے۔ دلی والی خالہ، اپنے ہاتھ نچا نچا کر کئی مرتبہ گلی والوں سے لڑ چکی تھی۔ اور گلی کا آوارہ کتا پہلے سے بھی زیادہ مریل ہو گیا تھا۔ غالباً اُس کی زندگی کا چراغ بھی بجھنے والا تھا

روشن کی بوڑھی ماں جمن، دل برداشتہ ہو کر اپنے رشتہ کے بھائی کے یہاں رہنے لگی تھی۔ اور اب اس کی واپسی کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ روشن دن کا زیادہ حصہ رشیدہ کے پاس گذارتی تھی۔

یا اسلم کا انتظار دیکھتے ہوئے بیڑیاں بناتی رہتی تھی۔ منا بچپن کی معصوم شرارتوں کو بکھیرتا بہن کے غمزدہ دل کو ناکام سہارا دے رہا تھا۔ اور پاگل کوارٹر کے کمرے میں پڑا ہوا ۔ دلوں سوتا رہتا تھا۔

رشیدہ کی آنکھوں میں غم کے کئی طوفان انگڑائیاں لیتے نظر آتے تھے۔ بھائی کی موت نے اُس کے دل پر جو زخم لگایا تھا۔ اسلم کی عدم موجودگی نے اُسے ناسور بنا دیا تھا۔ اور اب اس ناسور نے رِسنا شروع کر دیا تھا۔ درد کی ٹیسوں نے اُس کا سکون چھین لیا تھا۔ جب ٹیس اٹھتی تھی اس کی آنکھیں برسنا شروع ہو جاتی تھیں اور آن کی آن خالی طوفانوں کی جگہ پھر، گرجتے ہوئے طوفان لے لیا کرتے تھے۔ اُسے محسوس ہوتا تھا۔ تقدیر اس سے روٹھ گئی ہے۔ زندگی اُسے فریب دے رہی ہے اور وقت اس کا صبر آزما امتحان لے رہا ہے۔ اُسے اپنے چاروں طرف اندھیرے ہی اندھیرے دکھائی دیتے تھے۔ سیال اندھیرے جو کبھی آنسو بن کر اس کی پلکوں سے ٹپکتے تھے۔ اور کبھی سلگتی ہوئی روح کی اذیت ناک آہ بن کر دل و دماغ پر چھاتے نظر آتے تھے۔ وہ پہلے کچھ دنوں تک تو روشن کو بتاتی رہی۔ اپنی مجرو میاں، ناکامیاں، تلخیاں۔ لیکن اب کچھ دنوں سے وہ بالکل خاموش ہو گئی تھی۔ اُس نے اسلم کا نام لینا تک چھوڑ دیا تھا۔ ممکن ہے یہ اس کی شکست خوردگی کا شدید ردِ عمل ہو۔ جو آنسو بن کر کبھی زود زاں ہو جاتا تھا؛ اور سینہ کی جلن بن کر تا سبک

اسلم گذشتہ تین ہفتوں سے غائب تھا۔

روشن خود بھی پریشان تھی۔ رشیدہ کی دل جوئی، منے کی نگہداشت کے علاوہ اپنے اور اسلم کے کوارٹروں کی حفاظت بھی اس پر فرض تھی۔ اور ان تمام امور کے بعد ڈھیری بیڑیاں بنانا۔ جن کے بغیر زندگی کی گاڑی ایک قدم بھی نہیں چل سکتی تھی۔ رشیدہ نے کئی مرتبہ اُسے روکا۔ کئی مرتبہ اُس سے کہا۔ اتنی محنت نہ کیا کرو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ لیکن روشن اس کا کہا کس طرح مان سکتی تھی۔ اسلم اسے اس کی حفاظت میں دے کر گیا تھا۔ اور پھر وہ اتنی گئی گذری تو نہ تھی کہ ایسے وقت میں رفاقت سے انکار کر دے وہ تو رشیدہ کی خاطر اپنی محبت کو بھی قربان کر سکتی تھی۔ اگر اسلم رشیدہ کا ہو جاتا تو وہ اپنی محبت کا گلا کبھی کا گھونٹ چکی ہوتی وہ اپنے وجود کو کبھی کا پھونک چکی ہوتی۔ اُس کا دماغ محبت کی گتھیوں کو سلجھانے سے قاصر تھا۔ لیکن بعض اوقات نہ معلوم کیوں اُس نے صدق دل سے یہ چاہا تھا کہ اسلم رشیدہ کا ہو کر گھر واپس آجائے۔ اور وہ رشیدہ کو ایک امانت کی طرح اسلم کو لوٹا کر اپنے ویران گھر میں چلی جائے۔ جہاں کچے فرش سے اُبھرتی ہوئی بھیانک وحشت اُسے گھیر لے۔ اور دیواروں کی دراڑوں سے جھانکتی ہوئی نحوست اُس کا گلا دبا دے اور صبح جب رشیدہ اور اسلم آکر دیکھیں تو اُس کا سرد جسم اکڑا ہوا پڑا ہو۔

دن بھر روتے رہنے کے بعد تھکی ماندہ رشیدہ کمر سیدھی کرنے ابھی ابھی چارپائی پر لیٹی تھی۔ اس کے برابر پٹی سے لگی ہوئی روشن لیٹی ہوئی تھی۔ منا کبھی کا سو چکا تھا۔ اور پاگل صحن میں بیٹھا ہوا گذرتے ہوئے قافلۂ شب کو دیکھ رہا تھا۔ ٹیلر ماسٹر کے گھر میں آئے ہوئے مہمان زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ شاید آج ماسٹر کے یہاں چولھا نہیں جلا تھا۔ افلاس کی وہ لعنت جسے قرض لے کر اب تک ماسٹر نے چھپایا تھا۔ آج ایک ننگی حقیقت کی طرح سرد چولھے سے جھانک رہی تھی۔ اے ٹیلر ماسٹر کے فاقہ زدہ مہمانو! سو جاؤ۔ گلی کا آوارہ کتا بھی سو رہا ہے۔

رشیدہ نے آہستہ سے کروٹ بدلی۔ جاگ رہی ہو روشن۔

روشن کی آواز میں نرمی تھی۔ ہاں۔ تم سوئیں نہیں۔

تقدیر سو رہی ہے میرے جاگتے رہنے سے کیا ہوتا ہے۔ پھر وہ غمزدہ آواز میں بولی۔ اسلم بابو کو شہر گئے کتنے دن ہوتے؟

روشن نے جلدی جلدی انگلیوں پر حساب لگایا۔ تین ہفتے۔

رشیدہ کی آواز میں رقت تھی۔ اسلم بابو اب واپس نہیں آئیں گے۔

روشن خاموش رہی

اُس نے جملہ دہرایا۔ سنتی ہو روشن بھیا کی موت کے بعد اسلم بابو نے ہمیں بھی مردہ سمجھ لیا۔ وہ اب کبھی واپس نہیں آئیں گے۔

روشن قریب قریب چیخ پڑی الہامات کہو۔ وہ واپس آئیں گے۔

رشیدہ کی تلخ ہنسی روشن نے بھی محسوس کی۔ پگلی کہیں کی میں جانتی ہوں۔ تم بھی بابو سے پیار کرتی ہو!

روشن تڑپ کر روٹھ بیٹھی۔ اُسے اپنا جسم سُن ہوتا ہوا معلوم ہوا۔ رشیدہ بہن۔

پاگل۔ رشید کی موت کے بعد پہلی مرتبہ بولا۔ آسمان کا ہر ستارہ انگارہ دکھائی دے رہا ہے۔ کہکشاں کے دامن میں جلی ہوئی گم شدہ رعنائیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اپنے اٹل فیصلوں پر میں خود دُکھی ہوں۔

رشیدہ نے پاگل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ گاڈ صاحب تمہارے اٹل فیصلے مجھے معلوم ہیں۔ پھر وہ روشن سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ تمھیں بابو سے پیار ہے۔ میں جانتی ہوں۔ کسی سے محبت کرنا گناہ نہیں ہے۔ اسلم بابو میرے نہیں ہو سکے۔ وہ رونے لگی۔ میں انھیں اپنا بنا بھی نہیں سکتی تھی۔

روشن اُس کے منہ پہ سر رکھکر خود بھی رونے لگی۔ تم اتنی نا اُمید کیوں ہو رہی ہو۔

اب اُمید و نا اُمیدی کا سوال ہی نہیں ہے۔ میں ان تمام وادیوں سے گذر کر زندگی کی آخری حد کو چھو رہی ہوں۔ جہاں مجھے

اپنا سارا وجود سرد اور بے جان محسوس ہونے لگا ہے رشیدہ کو زور سے کھانسی اٹھی ۔ وہ چند لمحہ کھا نسنے کے بعد پھر بولی ۔ زندگی کے دامن میں میرے لئے کچھ بھی نہیں ہے ۔ اور اگر کچھ ہے بھی تو وہ ذلتیں ہیں ۔ رسوائیاں ہیں ۔ بدنامی ہے ۔ اور در در کی ٹھوکریں
روشن اُسے جھنجوڑتے ہوئے بولی ۔ خدا کے لئے ایسی باتیں مت کرو ۔
رشیدہ کی آواز میں غمزدہ تمکنت کا رچاؤ تھا ۔۔ میں نے کہا تھا نا اسلم بابو میرے نہیں ہو سکتے ۔ لیکن یہ میں جانتی ہوں وہ ایک دن تمہارے ضرور ہو جائیں گے ۔ یہ میرا ایمان ہے جن راستوں کو آج وہ بھولے ہوئے ہیں ۔ کل وہ پھر انھیں راستوں سے گذر کر تم تک آئیں گے ۔
پاگل کی آواز میں ایک غیر مرئی کیفیت تھی ۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے ۔ میرے فیصلے ۔ میری ربو بیت سے رحم کی بھیک مانگ رہے ہیں ۔ ۔ سرکش آندھیاں چلنے سے پہلے ہی بجھنے والے چراغ کا ماتم کر رہی ہیں ۔ اے آسمان وزمین کے نگہبان فرشتو ۔ میں بھی دکھی ہوں ۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے ۔ اس کی آواز میں یاسیت تھی ۔ بے شک اب کچھ نہیں ہو سکتا میرے قہر وغضب کا کوڑا ۔ نہیں نہیں ۔ میں سب کو معاف کرتا ہوں
رشیدہ نے روشن کے آنچل کو کھینچتے ہوئے کہا ۔ ایک دن

اسلم بابو ضرور آئیں گے۔

روشن بے ساختہ مسکرا دی - ہاں وہ ضرور آئیں گے

رشیدہ جیسے کسی گہرے کنوئیں میں سے بولی - جب وہ آئیں تو اُن سے میرا اسلام کہدینا

روشن کے جواب دینے سے پہلے پاگل پھر چلّایا - میں انسانوں کو شکست دینے اس دنیا میں آیا تھا - وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا - میں نے سوچا تھا - محترم انسان کو میں زندگی کے ہر محاذ پر شکست دوں گا - مگر آہ میرا انجام ' انسان پھر جیت گیا - وہ پوری طاقت سے چلّایا - اے آسمان و زمین کے نگہبان فرشتو - انسان پھر جیت گیا - حالات کی صلیب پر لٹک کر، اُس نے اپنے گناہوں کا کفارہ اپنے خون سے ادا کر دیا - انسان پھر جیت گیا -

نیند سے روشن کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں -

سچ کہتے ہو گا ڈصاحب - انسان پھر جیت گیا - تم ہار گئے - تمھاری ہار بھی بہت مہنگی پڑی - میرے بھیا کی موت - اسلم بابو، وہ ہچکیوں سے رونے لگی - پھر اسے اپنے چھوٹے بھائی کا خیال آیا جو برابر کی چارپائی پر پڑا - طفلی کے گہوارے میں نیند کے شاداب وقت کی اپسراؤں کی لوریاں سُن رہا تھا - وہ اُٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی پھر اسے اُس نے اپنے سینہ سے بھینچ لیا -

اے میرے ننھے بھیّا - مجھے معاف کرنا - میں تمھارے کام نہیں

آ سکی - اُس کی آواز کانپ رہی تھی - نہ تمہیں ماں باپ کا پیار ملا اور نہ بہن بھائی کا منے بھیا - تم کتنے بدقسمت ہو -

منے نے نیند میں کسمسا کر اُس کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیں رشیدہ آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی منے بھیا - میں تمہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں - بڑے بھیا نے مجھے بلایا ہے - تم رونا نہیں - سمجھے - اگر تم روئے تو میری روح کو تکلیف ہو گی - اس کی چیخ نکلتے سے رہ گئی - اُس نے منے کو اور پیار کیا - تمہاری بہن نے ایک باعزت فیصلہ کیا ہے - جب تم بڑے ہو گے تو میرے اس فیصلہ کو عزت کی نگاہوں سے دیکھو گے - ان حالات کو سمجھو گے جب زندگی کی روشنیوں سے منہ موڑ کر انسان موت کے اندھیروں کی طرف اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے - منے موت بھی تو زندگی ہے - زندگی کی ایک دوسری شکل جو یادوں کے ان گنت رنگوں سے ہنستی جھلملاتی ہے - تم ان یادوں کے رنگوں میں کبھی کبھی میری گریاں تصویر بھی تلاش کر لینا - منے تم بڑے ہو کر اپنے دل میں ایک کسک پاؤ گے ایک چبھن - جو میرے اور میری موت کے بارے میں تمہارے شعور کی ہمیشہ صحیح رہنمائی کرے گی - اور اسی مرحلے پر تم جو ہو گے - آپا نے جو کچھ کیا اچھا کیا - اس سے پہلے کہ دق کے کلبلاتے ہوئے جراثیم ان کے پھیپھڑوں میں چھید ڈال دیتے - سماج میں بکھری ہوئی لیتقیاں ان کی پاکیزگی کا مول کرتیں - ان کے جسم پر ہنس زدہ آوارہ کتے ٹوٹ کر

گرتے۔ انھوں نے موت کو گلے لگا کر انسانیت پر ایک بہت بڑا احسان کیا۔

منے نے کسمساکر اپنی باہنوں کے حلقے کو اور سخت کر لیا۔

منے۔ زندگی کی طرح موت بھی تو سچائی ہے۔ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے مجھے شاباش دو۔ میری ہمت بندھاؤ۔ تمھاری بہن ایک گھناؤنی زندگی کے تصور سے گھبرا کر عزت کے مفہوم کی قیمت ادا کر رہی ہے اب یہ مجرم سماج۔ اُسے نہ تو اپنی گرفت میں لے سکے۔ اور نہ تم میری طویل آبرو ریزی کے مرگھٹ میں پل کر جوان ہو گے۔

پاگل اکڑوں بیٹھا ہوا بڑے غور سے رشیدہ کی باتیں سُن رہا تھا روشن سو چکی تھی۔ اور ٹیلر ماسٹر کے خانہ زدہ مہمان بھی تھک ہار کر شاید اپنی آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وہ اپنی بھیگی آنکھوں کے ساتھ آہستہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس کا آنچل سر سے ڈھلک کر شانوں تک آگیا تھا۔ پھر وہ کھڑکی نما روشن دان سے باہر گلی میں دیکھنے لگی۔

تاریکی نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور گلی کا آوارہ کتا اس کے دروازے کے آگے پڑا ہوا خواب میں کسی کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ دبے قدموں سے اسلم کے کوارٹر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کی پیشانی بھیگ رہی تھی۔ اور کنپٹیاں دہکتا ہوا انگارا بنی ہوئی

تھیں کمرے پر چھائی ہوئی بے کراں تاریکی نے جھینگروں کے ساز کی لے سے اس کا استقبال کیا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹکی اور پھر بے سدھ ہو کر اسلم کی خالی چارپائی پر گر گئی۔ اس کی زخمی روح نے اس طرح ایک سکون سا محسوس کیا۔ پھر اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ جیسے وہ کمرے کی ایک ایک چیز سے پوچھ رہا تھا۔

اسلم بابو کہاں ہیں۔ اسلم بابو کہاں چلے گئے؟

لیکن کمرے کی ہر چیز سکوت کے زندانوں میں اسیر رہی۔ ہوائیں سسکیاں بھرتی رہیں۔ اور وقت کے اذیت ناک لمحے اس کے دل پر خراشیں ڈالتے ہوتے گذرتے رہے۔

رشیدہ آپ ہی آپ بڑبڑائی۔ میں تم سے رخصت ہونے آئی ہوں۔ تم اگر مجھے سہارا دیدیتے تو۔

پاگل اس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں بھی آگیا تھا۔

میں اپنے تمام فیصلے بدل دوں گا۔ میری ہار مجھے تسلیم ہے۔ اے روح القدوس۔ اپنی بھیڑوں کو بچا۔

رشیدہ نے چونک کر پاگل کو دیکھا۔۔ وہ گرجی۔ تم یہاں کیوں آئے ہو؟

پاگل عاجزی سے بولا۔ میں اپنے سارے فیصلے بدل دوں گا بچی اس نے پہلی مرتبہ گاڈ کو روتے ہوئے دیکھا۔

اگر آج کوئی نیا چراغ بجھ گیا تو عرش پہ بھی اندھیرا چھا جائے گا۔

چاند ایک کشن بردوش نازنیں کی طرح۔ اداس آسمان کے غرفے سے جھانک رہا تھا۔

وہ پاگل کو جواب دیئے بغیر کواٹرے نکل کر اپنے کواٹر میں آگئی آج کوئی نیا چراغ بجھ گیا تو عرش پر اندھیرا چھا جائے گا۔ سب جھوٹ، وہ اپنا سر پکڑ کر چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ اُس نے منے کو دیکھا۔ پھر روشن پر نظر ڈالی اور خاموشی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی چوڑیاں اُتار کر اپنے پلو میں باندھ لیں۔

پاگل رشید کے کواٹر میں چیخ رہا تھا۔ آج پھر خدا مجبور ہے۔ ایشور مجبور ہے۔ کوئی اس بجھتے ہوئے چراغ کو نہیں بچا سکتا۔ کوئی تو میری مدد کرو۔؟

رشیدہ نے تھوڑی دیر بعد پلو سے چوڑیاں کھول کر بار یک پیسیں اور پھر پھانک لیں۔ زندگی کے بجھتے ہوئے چراغ کو کون بچا سکتا ہے۔ پانی کا کٹورہ اُس نے اپنے منہ سے لگاتے ہوئے سوچا پاگل برابر چلّا رہا تھا۔ میں بھی آسمانوں کی طرف چلا جاؤں گا۔ عرش پر اندھیرا چھا جائے گا۔

اور جب صبح منے نے روتے ہوئے روشن کو اٹھایا تو سب سے پہلے اُس کی نظر رشیدہ کے سرد اور بے جان جسم پر گئی جو اُس کے پہلو میں پڑا ہوا اپنی حرارت کھو چکا تھا۔

روشن تھوڑی دیر کے لئے اپنے حواس میں نہیں رہی۔ اسی

لمحہ ٹیلر ماسٹر گلی میں چلّایا۔

گاڈ نے اپنا گلا گھونٹ کر خودکشی کر لی۔

اس کی لاش اسلم کے کواٹر میں پڑی تھی۔ اور جب لوگوں نے جاکر دیکھا تو واقعی پاگل مر چکا تھا۔ اور اُس کی نئی بائبل کے اوراق صحن میں بکھرے ہوئے تھے۔

اُس روز ایک ساتھ دو جنازے اُٹھے۔

جب اسلم اور اٹھیلا آج کے مخصوص بلاوے پر ٹیل کے مکان پر پہنچے تو ایک شور برپا تھا۔... انگریزی موسیقی کی سحر طراز دھن پر سب ناچ رہے تھے۔ مچلتے ہوئے جوان جسم سازوں کی لے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ کرنل قصار ٹیل کی کمر میں ہاتھ ڈالے جھوم رہا تھا ــ حق نواز کسی نئی لڑکی کے ساتھ۔ بی گل آفریدی اپنے خطرناک قسم کے پٹھان محبوب کے ساتھ۔ بیگم فصاحت یار جنگ کسی نئے آدمی کے ساتھ اور جولینا بھی کسی اجنبی پارسی وکیل کے ساتھ رقص میں مصروف تھی۔ عائشہ سب سے علیحدہ کھڑی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر اب تک کئی دلکش نغمے تھرک چکے تھے۔ اور اب وہ خود ایک نغمہ بنی ہوئی مصرعے کا ضروری تیر دکھائی دے رہی تھی۔

اٹیلا اور اسلم کو دیکھکر کرنل نے ایک زوردار نعرہ لگایا۔
عائشہ کے ہونٹوں پر نغماتی ہنسی قوس کی تجلی بن کر بکھر گئی۔
ٹیل نے قریب آکر ان دونوں کو خوش آمدید کہا
کرنل بھی بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا اُن کے قریب آچکا تھا۔
ناچتے ناچتے حق نواز نے انتہائی بھونڈے طریقہ پر جولینا کا گال چوم لیا
بیگم فصاحت یار جنگ کمال لطافت سے اپنے ہم رقص سے لپٹ گئیں۔ اور بی گل آفریدی، اپنے محبوب کے ساتھ انگلش ڈانس کے بجائے خٹک ناچ میں مصروف ہو گئی۔
کرنل نے اسلم سے پُرتپاک انداز میں پوچھا۔ کیا ہو گے
ٹیل نے اٹیلا کو اپنی باہوں میں بھینچ لیا۔ اطالیہ کی بلی تو بھی بتا۔
اطالیہ کی بلی مصنوعی طور پر غرائی۔۔ جو کبھی رل جائے۔
کرنل اسلم کے شانوں پر ہاتھ رکھکر بولا۔ آنے میں بہت دیر کی۔
اسلم نے اٹیلا کو شوخ نظروں سے دیکھا۔ "میرا ہر فیصلہ کسی دوسرے کے بس میں ہے۔
ونڈر رنل ٹیل نے بڑھکر اٹیلا کو چوم لیا۔ مبارک۔
اٹیلا کا چہرہ ۔ آلودہ تبسم کی کرنوں سے جگمگا اُٹھا۔
ملازم نے دونوں کو گلاس پیش کئے۔

عائشہ اور جولینا بھی ان سب کے قریب آ کر کھڑی ہو گئیں۔

جولینا نے شکایت کی۔ اس روز کی کافی۔

اسلم جلدی سے بولا۔ اس روز کی کافی آپ کو تنہا پینا پڑی ہو گی۔

جولینا چہکی۔ تم دونوں میں مجرم کون ہے۔

اسلم جلدی سے بولا۔ جو تمھارے مکان سے مجھے اغوا کر کے لے گیا تھا۔

ملی جلی ہنسی کا شور، گولہ بن کر پھٹا۔ جس کی گونج دیر تک سنائی دیتی رہی۔

اٹیلا نے اپنا گلاس خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔ میں اب تک خاموش تھی۔

کرنل نے ٹیل کی طرف آنکھ ماری۔ مجرم ہمیشہ خاموش رہتے ہیں۔

عائشہ نے لنمناتی آواز میں کہا۔ صفائی کے گواہ کو سب بھولے ہوئے ہیں۔

اور سب کے سب پھر ہنسنے لگے۔ بلند قہقہوں کا شور ایک بار تو آرکسٹرا پر بھی غالب آ گیا۔ کرنل خوش طبعی سے باتیں کر رہا تھا۔ مسٹر اسلم تم نے مجھے مبارک باد نہیں دی۔ ٹیل یقینی تم دونوں سے غصہ ہو جائے گی۔

اسلم نے بڑی لاپرواہی سے خالی گلاس ہوا میں اچھال کر

دبوچ لیا۔ ایک موزوں وقت کا انتظار جو تم دونوں کی شادی کے شایان شان ہو سکتا۔

اوہ تو پھر میں نے جلدی کی

ظاہر ہے۔ وہ اب دوسرا پیگ بھی پی چکا تھا۔ ظاہر ہے تم نے جلدی کی۔ تمھاری شادی ہو چکی ہے۔ میں تمھارا دعوت نامہ دیکھکر ہی سمجھ گیا تھا۔ یہ بات اٹیلا کے لیے نئی ہو سکتی ہے۔

اٹیلا جھپٹ کر ٹیل سے لپٹ چکی تھی۔ اور وہ دونوں اب ایک دوسرے کو پیار کر رہی تھیں۔ وہ بڑے موج میں تھا۔ تم کہو گے میں تقریر کرنے لگا۔ لیکن نہیں۔ میں تقریر نہیں کروں گا۔ تم نے اچھی خاصی عمر میں۔ ایک ویران جنت کو اپنایا ہے۔ اب اس جنت کو آخری سانسوں تک سجاتے رہنا۔

ٹیل اٹیلا عائشہ اور جولینا سے باتوں میں الجھی ہوئی تھی۔ اگر اسلم کی بات وہ سن لیتی تو یقینی کرنل کو بہت زیادہ خفت کا سامنا کرنا پڑتا۔

کرنل نے اسلم پر وار کرنا چاہا۔ تم نے بھی تو اٹیلا سے شادی کر لی ہے۔

اسلم تیسرا پیگ آہستہ آہستہ پی رہا تھا۔ نہیں اٹیلا مستقلاً مجھ سے وابستہ ہو چکی ہے۔ جونی نے شادی کے معاملے میں اُسے اچھا سبق دیا ہے۔

رقص ختم گیا۔ محفل ایک دم سونی ہو گئی۔ انگریزی موسیقی کی سحر طراز دھنوں کی کیفیت مٹ سی گئی۔ اور وہ سب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جیسے وہ تھک سے گئے تھے۔ رقص و انبساط کی شاہراہوں پر چلتے چلتے بھی قافلۂ حیات تھک سکتا ہے۔ بیگم فصاحت یار جنگ بڑے پیار سے اپنے نئے دوست کو تک رہی تھیں۔

کھانا تیار ہے۔ خانساماں نے آکر اطلاع دی۔

کرنل نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا۔ کھانے کی میز پر کئی مرغیاں آپ لوگوں کی منتظر ہیں۔ تشریف لے چلیے۔

عائشہ ہنستے ہوئے بولی۔ غالباً سبھی ترک فیاض ہونے کے ساتھ کافی عقلمند بھی ہوتے ہیں۔

اٹیلا نے پہلی بار فقرے بازی میں حصہ لیا۔ تم ایک قوم کی نفسیاتی گہرائیوں میں اُترتی جا رہی ہو۔

ہنستے ہوتے وہ سب کھڑے ہو گئے۔ برآمد والے کمرے میں کھانے کی میزیں تھیں۔ ٹیل نے درمیان میں پڑا ہوا پردہ جلدی سے ایک طرف سرکا دیا۔ وہ کھانے کی میز کے گرد جمع ہو کر پیٹ بھرنے کے ساتھ ساتھ گپ بازی میں بھی مصروف ہو گئے۔

اٹیلا نے آلو کا بڑا سا تلا اپنی پلیٹ میں ڈال لیا۔ ارے ٹیل، کرنل قصار تیرے سرانھ یسے ہی صحت مند رہیں گے۔ میرا مطلب ہے موٹے سرخ و سپید۔

ٹیبل بے ساختہ ہنس دی۔ یقینی۔ لیکن مسٹر اسلم کا حال تو تنے پتلا کر دیا ہے۔

وہ سب آپس میں بے تکلف تھے۔

بی گل آفریدی بڑے اصرار سے اپنے پٹھان محبوب کو اس کی مرضی کے خلاف چیزیں کھانے پر مجبور کر رہی تھی۔

کرنل اب شراب کے نشہ میں کتری ہوئی پیاز میز پر بکھیر کر قہقہے لگا رہا تھا۔

عائشہ کرنل کی اس حرکت پر ہنس ہنس کر دہری ہوتی جا رہی تھی

تھوڑی دیر بعد کھانا ختم ہو گیا۔

کرنل کھڑا ہو گیا۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ آج میں تقریر کروں گا۔ بہت طویل تقریر۔ وہ نشہ میں لڑکھڑایا۔ ٹیل نے اُسے سہارا دیا شکریہ ڈارلنگ۔ پھر وہ بولا۔ آپ دل میں حسد کر رہے ہوں گے میں نے آپ کو ڈارلنگ کیوں نہ کہا۔

عائشہ بولی۔ کرنل قصار۔ واقعی مسٹر اسلم کو تو ضرور آپ ڈارلنگ کہتے۔ سب ہنستے ہنستے دہرے ہو گئے۔

آپ میری تقریر سنیں۔ کرنل بلند آواز میں بولا۔ میں ہٹلر گونٹرنگ ہوں۔ مجنوں ہوں۔ میں نے ٹیل سے شادی کر لی ہے۔ ہاٹ تیرے کی ...۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ الفاظ میری زبان پر آ کر پھسل جاتے ہیں۔ مگر کیا پرواہ ہے میں تقریر کروں گا۔

دوستو مجھے مبارکباد دو۔ میں نے ٹیل سے شادی کرلی ہے قانونی شادی۔ اب ہم ایک ساتھ سفر کریں گے۔ آپ لوگ تالی بجائیں
سب نے بڑے زور سے تالیاں بجائیں۔ لیکن ٹیل کی تالی کی آواز سب سے زیادہ بلند تھی۔

میں بڑی اونچی نسل کا عاشق ہوں۔ مجبور عاشق۔ سالوں منڈ لاتے ہوتے سیال اندھیرے میرا تعاقب کرتے رہے۔ تنہائی کے خار دار بستر۔ میری راتوں کی نیند اڑاتے رہے۔ یہ ٹھیک ہے نا ٹیل میں اونچی اور خاص الخاص نسل کا فوجی عاشق ہوں۔ وہ بے ربط باتیں کرتا رہا۔ اس ملک کی شراب کتنی تیز ہوتی ہے۔ اب ٹیل روشنی بن کر میرے ساتھ رہے گی۔ اب میں جنس کی اتھلی اور بدبو دار نالیوں سے محفوظ رہوں گا۔ میں نے سچائی کو ٹیل کے روپ میں پایا۔ ہم سب ایک نہ ایک دن سچائی کی طرف لوٹنے پر مجبور ہیں۔ گناہ کا جذبہ ناپائیدار ہوتا ہے۔ بالکل میرے چاندی کے اس سگریٹ کیس کی طرح جو کل معمولی سی چوٹ کھا کر لوٹ چکا ہے۔ کمبخت کتنا گھٹیا سگریٹ کیس تھا۔

لیڈیز اینڈ جنٹلمین، آپ سُن رہے ہیں نا۔ میں کہہ رہا تھا۔ ہم سب سچائیوں کی طرف لوٹنے پر مجبور ہیں۔ کھوکھلے ضمیر۔ مردہ کردار۔ اور تھکی ہوئی جوانیاں سچائیوں کو جلد اپنا لیتی ہیں۔ ابدی عقوبت کا لاشعوری خوف، ہمیں گھٹنوں کے بل جھکا دیتا ہے۔ ازل سے یہی ہوتا آیا ہے۔ یہی ہوتا رہے گا۔ مگر کبھی ایسا بھی ہوسکتا کہ ہم

صحت مند دل و دماغ کے ساتھ اور ابدی عفوبت کے لاشعوری خوف سے بے نیاز ہو کر ان سچائیوں کو اپنا سکتے۔ جو حبس۔ اخلاق تہذیب، اور نفسیات کی شاہراہوں پر بکھری پڑی ہیں۔ کاش ہم مرغن کھانا کھانے کے بجائے، انہیں روحانی غذا سمجھ کر نگل جاتے۔

لیڈیز اینڈ جنٹلمین سچائی اپنانے کے معاملے میں بیگم فصاحت یار جنگ کا کنجوس نظام حیدر آباد نمبر ایک انسان ہے۔ لعنت ہو اس شخص پر جس کے پاس بے شمار جواہرات ہیں۔ اور جس کے حرم میں سینکڑوں عورتیں پڑی سڑ رہی ہیں۔

لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ آپ مجھے مبارکباد دینے سے پہلے مسٹر اسلم اور اٹیلا مارکونی کو بھی مبارکباد دیں۔ بلکہ زندہ باد کا نعرہ لگائیں میری طرح وہ دونوں بھی شاید ہمیشہ کے لئے نہیں تو کچھ عرصہ کے لئے ایک ہو گئے ہیں۔ کچھ عرصہ کے لئے میں نے یوں کہا ہے کہ وہ دونوں ابھی بھرپور جوان ہیں۔ اگر مسٹر اسلم شجر طور کی لچکتی ہوئی شاخ ہیں تو اٹیلا مارکونی، شاداب جنت کی مسکراتی ہوئی تجلی پاش قوس۔ اسی لئے ممکن ہے وہ کبھی کبھی جذبات کے بندھنوں کو توڑ پھینکیں۔ سب لوگ بے تحاشہ کرنل کو داد دینے لگے۔

دوستو۔ اب مجھے تقریر ختم کر دینا چاہیے۔ پھر اس نے اسلم پر ایک اور پرخلوص طنز کیا۔ ہمیں ایک دوسرے کے معاملے میں خود کو گنہگار کہتے ہوئے شرمانا نہیں چاہیے۔ وقتی گناہوں، کی ہنگامہ

آرائیاں، اگر عظیم سچائیوں کی پیش خیمہ بن جائیں تو ہمیں اپنے سابقہ گناہوں کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ کم از کم میں ایک مجرم کی حیثیت سے آپ لوگوں سے معافی کا خواستگار ہوں۔ کرنل اب کافی سنبھل کر بول رہا تھا۔ ماضی گذر چکا ہے۔ ہمیں اسے بھول جانا چاہیے۔ اُف میں کتنا دکھی ہوتا جا رہا ہوں۔ کل میں اور ٹیل ایک دوسرے برّاعظم کی طرف پرواز کر جائیں گے۔ سان فرانسسکو۔ روک بینڈ۔ جنوبی امریکہ کے شہر۔ اور پھر اناطولیہ کی وادی جہاں ہمارا گھر ہوگا۔ جہاں ہماری نسل پروان چڑھے گی۔ اور جہاں ٹیل باسفورس کے کنارے میرا انتظار دیکھے گی۔ ہم دونوں کل آپ لوگوں سے رخصت ہو جائیں گے۔ ہمارے پاس جو پس اندوختہ ہے وہ آپ لوگوں کی یادیں ہیں۔ بے رحم یادیں۔

کرنل نے تالیوں کے شور میں اپنی تقریر ختم کی۔

اسلم نے کرنل سے کہا۔ آپ بڑی اونچی نسل کے مقرر ہیں۔

اٹیلا کچھ سوچ کر شرمندہ سی تھی۔ ٹیل شادی مبارک ہو۔

جواب میں ٹیل نے اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

کرنل نے اسلم کو سگریٹ پیش کیا۔ اب میں اپنے ضمیر کو ہلکا پا رہا ہوں ـــ پھر وہ اٹیلا کے کان میں جھک کر کہنے لگا۔ اس تقریر سے تمہاری تضحیک منظور نہیں تھی۔ یہ ضمیر کی آواز تھی۔ جو الفاظ میں ڈھل کر ادا ہو گئی۔ ماضی گذر چکا ہے۔

اٹیلا نے آہستہ سے فقرہ دہرایا۔ ہاں ماضی گذر چکا ہے۔ اب میں محسوس کر رہی ہوں۔ بلاشبہ وہ رات ذلت انگیز تھی جب میں نے ٹیل کے حقوق نظرانداز کئے تھے۔

اسلم سگریٹ جلاتے ہوئے بولا۔ دائمی مفارقت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

اگر ہو بھی تو میرے لئے بے فائدہ ہے۔ کرنل عقیدت مندی سے بولا۔ مسٹر اسلم تم نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ میں ہمیشہ تمھارا ممنون رہوں گا۔ یہ نجیبت نہیں صاف گوئی ہے۔ اٹیلا جذباتی عورت ہے اور اس جذباتی عورت کی زندگی کا دھارا ہر کبھی بدل سکتا ہے۔

اسلم پھیکی ہنسی ہنس کر خاموش ہو گیا۔

اسی طرح کئی ماہ گذر گئے

اٹیلا سے اسلم کی وابستگی کا دور۔ پیار کی حدیں چھو لینے کے بعد کئی نفسیاتی الجھنوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس کا احساس دونوں کو تھا۔ اور دونوں اپنی اپنی جگہ ذہنی پریشانی میں مبتلا تھے۔ اسلم اس لئے پریشان تھا کہ وہ کئی دنوں سے اٹیلا کی آنکھوں میں چھائے ہوئے کسی گہرے دھندلکے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کیفیت کو بھانپ رہا تھا جو ایک اذیت بن کر اُس کے بشرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اور اٹیلا اس لئے پریشان تھی کہ دن گذرتے جا رہے تھے۔ لمحے بیتتے جا رہے تھے۔ اور وہ جو بات اسلم سے چھپانا چاہتی تھی اب اُسے زیادہ دیر اپنے دل میں چھپائے رکھنا اُس کے امکان سے

باہر تھا۔

یہ سچ ہے کہ اٹیلا جذباتی عورت تھی۔ اُس کے جذبات آندھی تھے۔ طوفان تھے۔ قیامت تھے۔ لیکن اس مرتبہ تو اُس نے کبھی خلاف معمول غیر معمولی قوت ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ پہروں سوچتی تھی۔ دفتر میں گھر میں۔ چلتے پھرتے۔ غرض ہر جگہ ایک فکر اُس کے ذہن پر چھایا رہتا تھا۔ اور یہ بات ایسی نہ تھی جسے اسلم محسوس نہ کرتا۔ اسی لئے تو وہ دونوں اب اپنی اپنی جگہ ذہنی طور پر مکمل پریشان تھے۔

اور پھر آخر ایک دن اسلم نے اٹیلا سے وہ سب کچھ کہہ دیا۔ جو بدگمانی کا عنوان بنا ہوا تھا۔

میں تم سے کچھ باتیں کروں گا

اٹیلا نے گھڑی دیکھی۔ اس وقت ڈارلنگ کیا باتوں کے لئے فرصت کے اوقات کم ہیں

اسلم نے بڑے کرب سے کہا۔ وہ اوقات اب ہم سے اپنا منہ موڑ چکے ہیں

اٹیلا ناگواری کے ساتھ چلائی۔ ڈارلنگ

اسلم کے ہونٹوں پر طنزیہ تبسم پھیل گیا۔ میں تمھاری ہر اُلجھن کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہوں۔ ہمیں ایک دوسرے سے سچ بولنا چاہیے۔

اٹیلا آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ تھکی تھکی نظر آنے لگی۔ ڈارلنگ

ایسی کوئی بات نہیں - تم میرے ہو نا - میرے سرتاج - آقا - شوہر سب کچھ -

اسلم خاموشی سے سنتا رہا

ہمیں ساتھ رہتے ہوئے کئی ماہ ہو چکے ہیں - ہم آئندہ بھی اسی طرح ساتھ رہیں گے -

اسلم صاف گوئی پر مجبور ہو گیا - ناممکن - اور وہ اس لئے کہ تم مجھے لاشعوری طور پر احساس دلا رہی ہو کہ یہ گھر میرا گھر نہیں ہے - یہ ماحول میرا ماحول نہیں ہے - اور تم بھی وہ نہیں ہو جو پہلے تھیں - عورت کے بدلے ہوئے رجحانات کا اندازہ مرد کا دھڑکتا ہوا دل خوب لگا سکتا ہے -

وہ کمرے میں اٹھکر ٹہلنے لگا

سنتی ہو اٹیلا - میں دیکھ رہا ہوں کئی دنوں سے تم ذہنی کشمکش میں گرفتار ہو - ایک ہسٹریا کے مریض کی طرح تمھاری نیند اڑی ہوئی ہے - تم مجھ سے کچھ چھپانا چاہتی ہو - تمھاری یہ چوری بھی کتنی عجیب ہے - جس کا احساس مجھے ہے - اور جس کے بارے میں میری روح سب کچھ جانتی ہے -

اٹیلا بڑی بیچارگی سے رونے لگی

میں تم پر جبر کرنا نہیں چاہتا - میں تمھاری عزت کرتا ہوں — باہمی احترام کی اس فضا کو پروان چڑھانے میں تم نے جس خلوص کا

مظاہرہ کیا ہے میں تمھیں اس کی قسم دے کر کہتا ہوں۔ مجھے بتاؤ — ایک دوست کی طرح مجھ سے امید رکھو۔ میں تمھیں صحیح مشورہ دوں گا

اٹیلا ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ پھر ایک دم اُس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ بات ضرور ہے۔ میں خود اس آگ میں زیادہ دیر نہیں جل سکتی۔ اُس نے اپنا پرس کھولا۔ اور ہوائی ڈاک سے آیا ہوا ایک خط اسلم کے سامنے پھینک دیا۔

اسلم نے خط اُٹھا کر دیکھا۔ جس میں طویل مفارقت کی کرب انگیز ساعتوں کے حال کے علاوہ یہ بھی لکھا تھا کہ وہ امریکہ سے پہلے روم گیا اور جب وہ وہاں نہ ملی تو اب مکتوب الیہ کراچی اُس کے پاس آرہا ہے۔ خط کے آخر میں جونی کے دستخط تھے۔

اٹیلا پھر رونے لگی۔ اب تم ہی بتاؤ نا ڈارلنگ میں کیا کروں؟

کیا تم جونی سے اب بھی پیار کرتی ہو۔

نہیں۔

نفرت کرتی ہو

نہیں

مجھ سے پیار کرتی ہو

ہاں

نفرت تو نہیں کرتیں

نہیں۔

جوتی کے سامنے بھی یہ کہہ سکو گی

نہیں۔

وہ کیوں۔؟

وہ میرے اولین گناہ کی ابدی اور سب سے زیادہ دلنشیں نشانی ہے۔ وہ میرے مشفقانہ جذبات کو بیدار کرنے والا پہلا مرد ہے۔ جسے میں نے محبوب کی طرح بھی چاہا اور بچہ کی طرح بھی پیار کیا۔ وہ میری سب سے بڑی کمزوری بن گیا ہے۔ میں نے تم سے ابدی رفاقت کا عہد کیا تھا۔ سوچا تھا۔ تم مجھے بلندیاں دے سکو گے۔ سچائی کی روشنی۔ میری روح کی تاریکیوں میں اُجالا کر سکو گے۔ میرے آوارہ جسم کے ایک ایک انگ کو چوم کر اُس پر اپنے پاکیزہ ہونٹوں کی مہریں ثبت کر سکو گے۔

لیکن کیا میں نے ایسا نہیں کیا۔

کیا۔ بے شک کیا۔ تم نے مجھے اپنے پیار کی چاندنی دی۔ اپنے دل کی دھڑکنوں کا آہنگ ریز نغمہ دیا۔ ازدواجی رشتے کی برکتوں سے روشناس کرایا۔ خود اعتمادی دی۔ وہ خود اعتمادی، جسے سب سے پہلے آئینہ سمجھ کر جوتی نے توڑ ڈالا تھا۔ اور جسے جوتی کے بعد ہر مرد نے توڑا تھا۔ تم نے ٹوٹے ہوئے آئینہ کی کرچوں کو جمع کیا۔ انھیں جوڑا۔ اور پھر انھیں نئی جلا بخش دی۔ میں تمھاری ممنون ہوں۔ میں تمھاری ممنون رہوں گی۔ اور بہت ممکن ہے اسی ایک خیال کے پیش نظر میں جوتی

سے التجا کروں کہ وہ پھر پہلے کی طرح کہیں دور چلا جائے تاکہ میں ایک وفا شعار عورت کی طرح تمھارے قدموں میں پڑی رہوں۔

جونی نے تمھاری بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو۔؟

اٹیلا ہکلاتے ہوئے بولی۔ نہیں نہیں۔ جونی اتنا ظالم نہیں ہے مجھے اُس سے نیک سلوک کی توقع ہے۔ میں اُس سے کہوں گی۔ مجھے یہ ماحول پسند ہے۔ وہ ضرور مان جائے گا۔

تھوڑی دیر کے لئے سمجھ لو کہ وہ نہیں مانا پھر۔ اسلم بدستور ٹہل رہا تھا۔

تو پھر۔ تو پھر۔۔ وہ گھبرا سی گئی

اسلم اُس کے قریب آگیا۔ تو پھر کیا کرو گی تم؟

میں تم سے کہوں گی۔ جونی کی ضد اگر یہی ہے تو تم۔ اُس نے بڑی تکلیف سے جملہ پورا کیا۔ میں تمھارے پاؤں پکڑ کر کہوں گی۔ تم جونی سے ہار مان لو۔ تم مجھے اسی دوزخ میں دھکیل دو۔ جہاں کی دہکتی ہوئی آگ میرے جیسی کئی آوارہ جسموں کو جلا کر راکھ کر سکتی ہے۔ وہ روم سے میری خاطر روانہ ہو چکا ہے۔ یہ تو سوچو اسلم۔ وہ میری خاطر اتنا تھکا دینے والا سفر کر رہا ہے۔ مگر نہیں ایسا سوچتے ہوئے تمھیں تکلیف ہوگی۔ میں تمھیں کبھی مغموم نہیں دیکھ سکتی۔ بخدا میں تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتی کہ تم مجھ سے جدا ہو جاؤ۔

وہ پاک خدا۔ اُس نے صوفے سے اپنا سر لگا دیا۔ میں مر کیوں

نہیں جاتی۔

اسلم کرسی پر سے اپنا کوٹ پہن چکا تھا۔ وہ ایک تھکا دینے والے طویل سفر کے بعد تم تک آئے گا۔ اُسے تنہائی و آرام کی شدید ضرورت ہوگی۔ میری موجودگی سے ممکن ہے جونی بدمزہ ہو۔ اس لئے میں ابھی سے جا رہا ہوں۔

انیلا غمزدہ آواز میں چلائی، ڈارلنگ جذباتی مت بنو۔

اسلم دروازے کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ ہم دونوں نے بہت اچھے دن گذارے ہیں۔ میں ان کی یاد لئے رخصت ہو رہا ہوں۔ مجھے تمہاری مہربانیاں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ اس عرصہ میں میں نے بہت کچھ کھویا اور بہت کچھ پایا۔ آج سے میری زندگی قہقہہ بھی ہے اور آنسو بھی۔ میں تمہیں رنج دینا نہیں چاہتا۔ تم بہت اچھی۔ اور نیک لڑکی ہو۔ میں ہنسوں گا بھی اور روؤں گا بھی۔ میں نے بیک وقت جو کچھ گنوایا ہے وہ نا گیا اب کبھی واپس نہیں ملے گا

انیلا۔ اُس کی آواز میں نرمی تھی تمہیں جونی واپس مل رہا ہے اور مجھے اپنا وہ پیار۔ جسے خود میں نے ٹھکرا دیا تھا۔ اب تک ہم دونوں مسلسل غلطیوں کا ارتکاب کر رہے تھے۔ جس ماحول میں تم تھیں۔ وہ تمہارا ماحول نہیں تھا اور جس ماحول کو میں نے اپنا سمجھا تھا وہ میرا نہیں تھا۔ آج ہم دونوں ایسی سچائیوں کی طرف جا رہے ہیں۔ جو معنوی اعتبار سے ضرور مختلف ہیں اس کے معیار بھی جُدا

جدا ہیں —— مگر یہ دونوں سچائیاں اپنی جگہ اٹل ہیں۔

اٹیلا برابر رو رہی تھی۔

آئندہ جونی ان آنسوؤں کی قدر کرے گا۔ یہ اس کی محبت کا عنوان ثابت ہوں گے۔ جو گواہی دیں گے کہ تم میرے ساتھ بھی لاشعوری طور پر کس قدر دکھی تھیں۔ اٹیلا میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ کوئی کسی پر احسان نہیں کیا کرتا ہے۔ یہ سماج کی وہ کھوکھلی اصطلاح ہے۔ جسے آج تم نے اور بے معنی ثابت کر دیا۔ خدا کرے۔ جونی کے نظریات بھی ایسے ہی ہوں۔

اٹیلا۔ اگر دیکھا جائے تو میں تمہارا۔ اور اپنے ماحول کا سب سے بڑا مجرم ہوں۔ میں جس سماج کی اکائی تھا۔ وہاں تراج تھا۔ غلاظتیں تھیں۔ جہالت تھی۔ آنسو اور آہیں تھیں۔ مفلسی کے داغ اور بیکاری کے دھواں دھار مرگھٹ تھے۔ رشیدہ اور روشن کا پیار تھا۔ ایک پاگل انسان کی بے ریا دوستی تھی۔ میں ان سب کو ٹھکرا کر۔ ان سے آنکھیں پھیر کر۔ اور اپنے جسم کے کوڑھی حصوں کو چھپا کر روشنیوں، تجلیوں، اور برق پاشیوں کی مصنوعی دنیا میں عورت کا پیار اور سکون کے سانس ڈھونڈنے آیا تھا۔

اٹیلا میں بھول گیا تھا۔ اپنے ان آڑے ترچھے کواٹروں کو جہاں اندھیروں کی غم انگیز صلیب پر ان گنت آدمی لٹکے رہتے ہیں جہاں جھینگروں کے ساز بیٹے دود آلود فضا میں تحلیل ہو کر رات کو

اور کبھی ڈراؤنا کر دیتے ہیں۔ میں بھی کتنا ذلیل انسان ہوں۔ میں ان سب کو بھول گیا تھا۔ ان مظلوم کنواریوں کی یاد کبھی میرے دل سے جاتی رہی تھی۔ جو اپنے ماں باپ کے دل پر ایک بوجھ بنی بیٹھی رہتی ہیں۔ اور مفلسی جن کی زلفوں میں سہاگ کی افشاں بکھیرنے کی بجائے کافوری سفیدی بکھیر دیتی ہے۔ میں ان سب کو بھول گیا تھا۔۔۔ اب میں اپنے اسی ماحول میں واپس جا رہا ہوں۔۔ ایک سچائی کی طرف۔ اٹل صداقت کی طرف۔ جہاں ہر چیز پائیدار ہے۔ ظلمتیں نراج۔ ذلتیں۔ وہاں ہر چیز محکم ہے۔ وہاں میری راہ میں کوئی جوتی نہیں آئے گا۔ وہاں کسی کا پیار سمندر کا جوار بھاٹا ثابت نہیں ہوگا۔

وہ تیزی سے دروازے سے باہر ہو گیا۔ اٹیلا اپنی پوری طاقت سے چلائی۔

ڈارلنگ واپس آجاؤ۔ خدا کے لئے واپس آجاؤ۔۔ پھر وہ لمبی لمبی ہچکیاں لینے لگی۔

آج بھی بڑی دیر بعد اُسے ایک خالی کرسی دستیاب ہو سکی تھی اور اب وہ کرسی پر بیٹھا ہوا چائے کی گرم پیالی سے اپنے تھکے ہوئے اعصاب کو سکون پہنچا رہا تھا۔

باہر روشنیوں کا سیلاب رواں دواں تھا۔

وہی ماحول۔ وہی ہنگامے۔ وہی ایرانی کیفے کے دوڑتے ہوئے بیرے۔ وہی پرانے گاہک۔ فلم پروڈیوسر۔ مدقوق شاعر۔ بلیک مارکیٹیے۔ اور کاؤنٹر پر اونگھتا ہوا ہوٹل کا ایرانی مالک۔

برابر والی میز پر وہی فلم پروڈیوسر بیٹھا ہوا اپنی کسی تازہ ناکام فلم کا ماتم کر رہا تھا یہ باتیں اُس کے لئے اجنبی نہ تھیں۔

سالا اپن جو بھی فلم بناتا ہے وہ اول ہفتہ ہی کھلاص ہو جاتا ہے۔

مدقوق شاعر اسی طرح آج بھی بحث کر رہے تھے۔

فن برائے فن

فن برائے ادب

فن برائے زندگی

لیکن آج اُس نے یہ نہیں سوچا کہ ان کی بیویاں اپنے گھروں میں بیٹھی ان کے بے نام فن کو کوس رہی ہوں گی۔ خون تھوک رہی ہونگی در گھونگھٹ کی اوٹ میں جل جل کر موت کو گلے لگا رہی ہوں گی

ٹی ایس ایلیٹ لکھتا ہے۔

وہ ضرور کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہے

میکسم گورکی کہتا ہے۔

گورکی آفاقی مصنف تھا۔ زندہ جاوید شخصیت۔

بیرا۔ ایک پلیٹ چانپ

بیرا۔ سنگل بریانی

بیرا۔ کھوب گرم ڈبل چائے بولو

اُس نے بیرے کو اشارے سے اپنے قریب بلایا

بیرہ اُسے جان گیا کیا ایک گلاس پانی چاہیے۔

غریبی نے اسے فراخ دل بنا دیا ہے۔ وہ اسے کبھی معاف کر دے گی۔ وہ رشیدہ کا مجرم ہے۔ اُس کے بھائی کی وفات کے بعد اُس نے اُسے بے سہارا چھوڑ دیا تھا۔ حالات کے گندے جوہڑوں

ہیں - جہاں کی ہلکی سی کیچڑ بھی - کپڑوں پر داغ ڈال سکتی ہے ۔۔۔ رشیدہ بے مہار اتھی - نہ معلوم وہ اس کے انتظار میں بیٹھی ہو گی یا جوانی کی لطیف تر خواہشوں کی تکمیل کی خاطر وہ ہمیشہ کے لئے کسی اور کی ہو گئی ہو گی - مگر اسے یقین تھا - وہ جس معاشرے میں پلی بڑھی ہے - وہ ایک گندہ جوہڑ سہی - غلاظت کا تالاب سہی - مفلسی اور بیماریوں کا سمندر سہی - لیکن اس مدقوق معاشرے میں پلنے والی عورتیں - ایک مرتبہ پیار کا گھنا جال بُن کر توڑتی نہیں ۔۔۔ جنسی لحاظ سے وہ اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد رکھتی ہیں - رشیدہ اُس کا انتظار دیکھ رہی ہو گی - اور روشن - روشن - ؟

اُس نے چائے کا دوسرا کپ بناتے ہوئے سوچا -

روشن بھی تو اس سے پیار کرتی ہے - ایک سانولی سلونی لڑکی - جو رشیدہ ہی کی طرح مظلوم ہے - جو محبت کے معاملے میں اپنی ناکامیوں پر ساری عمر روتی رہے گی - پھر وہ کیا کرے - اُس نے پہلی مرتبہ ایک عجیب سی اُلجھن محسوس کی

ایرانی کیفے کا ہال گاہکوں کی سرگوشیوں کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا -

بیرا ۔۔۔۔ ایک پلیٹ بریانی

بیرا ۔۔۔۔ ہاف سیٹ چائے تین پکوڑا

اس نے بیرے کو بل ادا کیا - بخشش دی - اور پھر بغیر فیصلہ کئے ہی باہر نکل آیا - ٹے کے نمبر بتانے والا نصیرا ابھی تک اپنی جگہ کھڑا تھا -

اُس نے بابا کی طرف اکنی بڑھا دی - کل کیا نمبر آئے گا بابا؟
فقیر نے اُسے گھورا - جو نمبر بھی تو کہے گا بیٹیا - تیری گردش کے دن ختم ہو گئے ہیں -

گردش کے دن تو کبھی ختم ہو ہی نہیں سکتے - اسلم آگے بڑھ گیا رشیدہ - اور اُس کا طویل انتظار - روشن - اور اُس کا معصوم پیار - وہ چلتے چلتے رک گیا - وہ کیوں نہ کہیں اور چلا جائے - کراچی سے باہر - جہاں نہ کوئی روشن ہو نہ رشیدہ - جہاں نہ یہ بے کواڑ والے کواٹر ہوں - اور نہ ان کواٹروں کی دحشت انگیز آڑی ترچھی قطاریں - مگر نہیں - اُس کے ذہن نے فوراً اس فیصلہ کو رد کر دیا - یہ کوئی اچھی بات نہ ہو گی - تمھیں اپنے مرکز کی طرف لوٹ جانا چاہیئے گندے جوہڑوں کی غلیظ دنیا میں - پیٹ کے بل رینگتے ہوئے انسانوں کی آبادی میں - جہاں ننگ دھڑنگ ننگے بچوں کے ہجوم دن بھر گلیوں میں مارے مارے پھرتے ہیں - جہاں نئی پود کے مجرمانہ ذہن کی تکمیل کے لئے قدم قدم پر مواقع ہیں - تم اسی ماحول کی پیدادار ہو زندگی نے تمھیں یہی کچھ دیا ہے - زندگی کے اس فیصلے کو منظور کر لو - دوسری غلطی نہ کرو -

سعود آباد جانے والی بس ٹریفک سگنل کی سرخ روشنی دیکھکر اُس کے سامنے رک گئی -

وہ بس میں سوار ہو گیا —

سنڈیکیٹ کی بس فضا میں شور بکھیرتی روانہ ہو گئی۔

اسلم نے چلتی ہوئی بس میں سے باہر دیکھا۔

آج اندھیروں میں کتنا جمال ہے۔ یہ کسی بھی نئی سحر کی دلیل بن سکتے ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس کا دماغ شعور کے ایک ایک خاکے کی تکمیل کر رہا تھا۔ اسے شاید پہلی مرتبہ امنڈتے ہوئے سیال اندھیروں کی گھمبیرتا میں جمال نظر آیا۔ اس نے ان جھونپڑیوں پر نظر ڈالی۔ جو اطراف و جوانب میں میلوں پھیلی ہوئی تھیں۔ آج اس نے یہ نہیں سوچا کہ سنڈیکیٹ کی بھاگتی ہوئی بس کا انجن ایک شور کے ساتھ پھٹ جائے۔ اور آس پاس کی بلڈنگوں کے مکین اپنی اپنی بالکنیوں پر آجائیں جھونپڑی نشین جاگ اٹھیں اور وہ اُن کے سامنے تقریر کرنا شروع کر دے۔

آج وہ سوچ رہا تھا

یہ لوگ سوتے رہیں تو اچھا ہے۔ بیداری کا ہنگامہ آپ انھیں جگا دے گا۔ صدیوں کی نیند۔ اضمحلال۔ افسردگی قنوطیت۔ جب نئی سحر کی کرنوں میں غسل کرے گی تو۔ تلخ اور حوصلہ شکن حالات کے دیوتا۔ اپنے نیند کا افسوں خود مٹا دینے پر مجبور ہو جائیں گے

بس دوڑتی رہی۔

کارساز بس کنڈیکٹر چلایا۔

خدا بڑا کارساز ہے۔ دِس کی شان ہے جو زمین پر اتنی بہت سی کاریں دوڑ رہی ہیں۔ وہی چہرہ، وہی انسان۔ وہی یوپی کا مہاجر

وہ مسکرا دیا۔ بس دوڑتی رہی ۔ کنڈیکٹر ہر بے نام فاصلہ طے ہو جانے پر ۔ کسی منزل گمنام کی صدا لگاتا رہا۔

پی ۔ اے ایف

ڈرگ روڈ

اسٹار گیٹ

آخر اس کی منزل بھی آ ہی گئی ۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بس چھوڑ دی ۔ اسلم نے ٹھنڈی سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آج میرے پاس ندامت اور شرمندگی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ رشیدہ نہ جانے کیسی ہو گی ۔ اور میرا مخلص دوست پاگل ۔ جونی اوا تھی ایک عظیم انسان ہے ۔ اور وہ ٹیلر ماسٹر ۔ گلی کا خارش زدہ کتا ۔ ہاتھ نچا کر لڑنے والی دلی والی خالہ ۔ مدراسی خاندان کے بے ہنگم سیاہ فام بچے ۔۔ روشن کی ماں جمن ۔ آسمان پر بڑا سا ستارہ ٹوٹ کر فضا میں تحلیل ہو گیا ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ جن میں سسکتی ہوئی انسانیت کے سینکڑوں حقیقت افروز افسانے اور افسانوں کے زندہ کردار رقص کر رہے تھے ۔

گلی کا خارش زدہ کتا بڑی زور سے بھونکا

تو بھی مجھے بھول گیا ۔ اسلم نے کتے کو پچکارا ۔ اور دوسرے ہی لمحہ کتا اس کے قدموں میں لوٹنے لگا ۔

میرے عظیم دوست میں آ گیا ہوں ۔ ابدی رفاقت کا عہد کر کے ۔

وہ آگے بڑھ گیا۔ کتا اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

رشیدہ کے کوارٹر میں ابھی روشنی ہو رہی تھی۔ وہی مٹی کے تیل کی بے نور روشنی۔ وہی چھوٹا سا ایک چراغ۔ جس کی لَو دھواں اُگل رہی تھی۔ اسلم نے کھڑکی کے نمار روشن دان سے جھانک کر دیکھا۔ منا چٹائی کے فرش پر اپنی کتابیں پھیلائے سبق یاد کر رہا تھا۔ اور منے کی طرف پُشت کیے ایک دوسرا سایہ بیٹھا تھا۔ چراغ کی مدھم روشنی نے اُسے مکمل فریب دیا۔

اسلم نے آہستہ سے آواز دی۔ "رشیدہ"

کوارٹر کے اندر سے نسوانی آواز چیخ بن کر پھیل گئی۔ اسلم بابو آگئے۔

منا کتابیں پھینک کر بھاگا۔

روشن اپنا دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

اُس نے منے کو گود میں اٹھا کر پیشانی پہ چوم لی۔

اچھی تو ہو روشن۔ اُس کی آواز میں بھرپور خلوص تھا۔

وہ اندر آگیا

رشیدہ کہاں ہے؟

روشن خاموش رہی۔

رشیدہ کہاں ہے وہ گھبرا سا گیا۔ گارڈ صاحب کہاں ہیں؟

روشن کی آواز میں نسوانی طنز تھا۔ منے بتادو۔ تمھاری آپا کہاں ہیں۔ اور گارڈ صاحب بھی۔

منے نے بڑی افسردگی سے کہا۔ وہ دونوں اللہ میاں کے ہاں چلے

...... روشن آپا کہتی ہیں وہ اب کبھی نہیں آئیں گے۔؟

اسلم نے منّے کو گود سے اُتار دیا۔ وہ رو بھی نہیں سکا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے روشن کی طرف گھور رہا تھا۔ روشن کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اُس نے تمہارے غم میں خودکشی کرلی۔ وہ آخر دم تک تمھیں یاد کرتی رہی۔ انتظار دیکھتی رہی۔ اور جب تم نہیں آئے تو اُس نے زمانے کی ذلتوں سے بچنے کے لئے اپنی چوڑیاں پیس کر پھانک لیں ——

سنتے ہو بابو۔ رشیدہ مرگئی۔ پاگل بھی مرگیا۔

پاگل نے بھی اپنا گلا گھونٹ لیا۔ وہ آسمانوں کی طرف چلا گیا۔ اسلم کو محسوس ہوا جیسے کسی نے لوہے کی گرم گرم سلاخ اُس کے دل میں گھونپ دی ہے۔ وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ جہاں رشیدہ نے دم توڑا تھا اب وہاں اُس کے آنسو برس رہے تھے۔

وہ روتے ہوئے بولا۔ مجھے اپنی کوتاہی کا اعتراف ہے۔ لیکن تم نے بہت جلدی کی۔ رشیدہ۔ کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ تم میری واپسی کا اور کچھ دنوں انتظار دیکھتیں

وہ مرنے والی کے غم میں احتراماً ذرا تو جھک گیا۔ تم ایک درد کی ٹیس بن کر ہمیشہ میرے دل کی گہرائیوں میں۔ بے بسیوں .... نامرادیوں۔ اور محرومیوں کے غار پھیرتی رہو گی۔

رشیدہ ——

تم مری نہیں ہو۔۔ میں تمہاری موت کو اُس وقت تک تسلیم

کرنے سے قاصر ہوں۔ جب تک حالات کے گندے جوہڑوں میں انسان اسیر رہیں گے۔ اور محرومیاں ہمارے گھر کے دروازوں کے سامنے رقص کرتی رہیں گی۔ تم اُس وقت تک زندہ رہو گی۔ جب تک آدم کی اولاد گندم کی بالوں کے اطراف دیوانہ وار ناچتی رہے گی۔ تمہاری زندگی کا لمحاتی نظام بہت دراز ہے۔ میں تمہارے سانسوں کی آواز اُس وقت تک سنتا رہوں گا۔ جب تک ارتکاب گناہ کی خواہشیں دلوں سے ختم نہیں ہو جاتی ہیں۔ اور مہجور دل گرفتہ محبت تمہارے ہونٹوں پر رنگ بن کر نہیں بکھر جاتی ہے۔

ہاں۔ اُس وقت تک تم اور گاڈ دونوں زندہ رہو گے۔ اُس دن نہ تو میں پھر تمہارا دل توڑ سکوں گا۔ اور نہ مخلص دوست پاگل۔ فرطِ احساس کے مارے خودکشی ہی کر سکے گا۔

وہ برابر رو رہا تھا۔ آنسو اُسے تسکین پہنچا رہے تھے۔ اس کی روح ایک گونہ قرار محسوس کر رہی تھی۔ پھر اُسے احساس ہوا جیسے کوئی اُس کے آنسو اپنے آنچل سے پونچھ رہا ہے۔

روشن۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا

روشن بھی رو رہی تھی۔ اسلم بابو۔ میں بھی تمہارا انتظار دیکھ رہی تھی۔

اور اسی لمحہ اسے پیار کی نئی کرن احساس کے مطلع پر پھیلتی ہوئی دکھائی دی۔ اور اس کا دل اس روشنی کے افسوں میں

اسیر ہوکر رہ گیا۔ جیسے یہ سارے مراحل اُس نے روشن کے پیار کو آزمانے کی خاطر خود ترتیب دیئے تھے۔

اسلم نے روشن کو اپنے سینہ سے لگا لیا

منا حیران کھڑا ہوا تھا۔

روشن نے اسلم کے شانوں پر اپنا سر رکھ دیا

یہ رشیدہ کی امانت ہے۔

میں اسے تمھارے پیار کا تحفہ سمجھوں گا۔

اسلم نے منے کو گلے سے لگا کر اپنے ہاتھوں پر اُچھالنا شروع کر دیا۔

کیا یہ درست نہ تھا۔ ایک لاشعوری اُلجھن کے نا ہونے کے بعد۔ اسلم اب گندے جوہڑوں کے تالاب میں رہتے ہوئے بھی مسکرا سکتا تھا۔

صبح ہی صبح گلی میں شور ہو گیا۔

اسلم بابو آ گئے۔

ٹیلر ماسٹر نے بڑے خلوص سے اُس کی مزاج پُرسی کی۔

دلی والی خالہ حیرت زدہ تھیں۔

مرزا ہی خاندان کے بے ہنگم بچے اُسے جھانک جھانک کر بھاگ رہے تھے۔

گلی کا آوارہ کتا اُس کی چارپائی کے نیچے گھسا ہوا سو رہا تھا۔

منا اسکول جا چکا تھا۔

اور روشن لجائی لجائی باورچی خانے میں صبح کا ناشتہ تیار کر رہی تھی۔

وہ گذری ہوئی رات نہ تو کسی شجر درد کا پھل تھی۔ اور نہ اس رات جھینگروں نے آڑی ترچھی دیواروں میں پڑی ہوئی دراڑوں میں اپنے وحشت ناک ساز نئے ہی چھیڑے تھے۔

نوجوان دلوں کے محبوب ادیب قیسی رامپوری کا

دلچسپ ناول

رسائی

اکثر مشاہدے سے گذرا ہے زندگی میں
پلتی ہے دشمنی بھی آغوشِ دوستی میں

— ایک جاہل، سادہ لوح مگر وفا شعار ہستی کی سرگذشت جس نے اپنے محبوب کی خاطر دنیا کے مصائب و آلام کو اپنایا۔

— ایک وفا سرشت اپنے محبوب کو حاصل کرنے میں کامیاب تو ہوگیا، مگر اس کا خلوص و پیار حاصل نہ کر سکا۔

— ایک مہذب و تعلیم یافتہ انسان جسنے اپنے دوست سے دغا کی اور اس کی سادہ لوحی سے اسکی کائناتِ محبت کو لوٹ لیا

— دو متضاد کرداروں کی دل گداز کہانی۔

— ایک کافر ادا دوشیزہ کی داستان۔ جسنے پیمانِ وفا کے تار و پود بکھیر کر رکھدیئے

— حسن و عشق، فرض و محبت کی ایک ایسی دلدوز کشمکش جسے مطالعہ کے بعد آپ بھلا نہ سکیں گے۔ —— قیمت — پانچ روپیہ آٹھ آنے

شیخ شوکت علی اینڈ سنز

ناشران و تاجرانِ کتب — بندر روڈ، کراچی